قواعد تعظیم الأدلة"

کتاب و سنت کے دلائل کا احترام: اصول و قواعد

مقدمہ مترجم

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين، محمدٍ وآلہ وصحبہ أجمعين، أما بعد:

یہ چھوٹا سا رسالہ دراصل شیخ ولید بن راشد السعیدان ـــ حفظہ اللہ ـــ کے دروس کا اردو ترجمہ ہے۔ شیخ صاحب سرزمینِ حجاز کے معروف و مشہور علما میں سے ہیں۔ ان دروس میں انہوں نے ایک نہایت اہم اور علمی قدر و قیمت کی حامل کتاب "**قواعد تعظيم الأدلة** "کی شرح بیان کی ہے۔

شیخ صاحب نے اپنے دروس میں اہلِ سنت والجماعت کے اصولِ اعتقاد و فقہ کے نہایت اہم قواعد کو تفصیل سے واضح کیا ہے۔"اہل بدعت کے مقابلے میں، اہل سنت والجماعت کے تمام اصول چاہے وہ عقیدے سے متعلق ہوں یا دیگر شرعی احکام سے، سب قرآن و سنت کی بنیاد پر قائم ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ جہاں کہیں غلط اصول پایا گیا ـــ خواہ وہ کسی بھی مذہب یا مسلک کے علما کی طرف منسوب ہو ـــ وہاں اس کا مدلل اور نہایت پختہ رد بھی پیش کیا ہے۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہ دروس محض کتابی انداز میں بیان نہیں کیے گئے، بلکہ درس و تدریس کے ماحول میں شاگردوں سے براہِ راست گفتگو اور سوال و جواب کے ساتھ ریکارڈ کیے گئے ہیں۔ اسی وجہ سے اس رسالے میں بعض مقامات پر ایسے جملے یا باتیں بھی ملیں گی جو بظاہر اصل موضوع سے ہٹ کر محسوس ہوں، لیکن دراصل وہ شیخ کی اپنی تدریسی گفتگو کا حصہ ہیں۔ لہٰذا قارئین سے گزارش ہے کہ انہیں اسی سیاق و سباق میں سمجھا جائے۔

امید ہے کہ یہ ترجمہ اہلِ علم اور طلبۂ علم کے لیے نفع بخش ثابت ہوگا اور کتاب و سنت کی عظمت کو دلوں میں مزید راسخ کرنے کا ذریعہ بنے گا۔

واللہ الموفق، وعلیہ التکلان.

فیض اللہ خان

ترجمہ شرح قواعد تعظیم الادلہ

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على رسول الله الأمين، وعلى آله وأصحابه الطيبين الطاهرين، ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين، وأن معهم بمنِّه وكرمه وفضله وجوده، إنه جواد كريم.

ہم اللہ عز وجل سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اور آپ کو قول و عمل میں اخلاص عطا فرمائے، اور ہمارے اعمال کو ہمارے اوپر وبال نہ بنائے، اور ہمارے دلوں میں سوائے کامل اخلاص کے کچھ نہ جانے۔ کیونکہ سب سے بڑی عبادتوں میں سے ایک علم حاصل کرنا اور علم سکھانا ہے۔ اس لیے لازم ہے کہ یہ عبادت اللہ عز وجل کے لیے خالص ہو۔

خبردار! اللہ عز وجل تیرے دل میں یا تیرے دل کے کسی حصے میں اپنے چہرے (یعنی رضا) اور آخرت کے سوا کوئی اور ارادہ نہ دیکھے۔

اور دلوں کے معاملے میں سب سے بڑی مددگار چیز یہ ہے کہ بندہ علام الغیوب عز وجل کے سامنے لمبے عرصے تک گڑگڑائے۔ اس طرح کہ وہ اللہ عز وجل سے بار بار دعا کرے کہ وہ اسے اپنے اعمال میں مخلصین میں شامل کردے۔ ورنہ دلوں کے معاملات اکثر اپنے مالکوں کے ہاتھ سے نکل جاتے ہیں، خاص طور پر اس زمانے میں۔ ہاں! خاص طور پر اس زمانے میں۔

لہٰذا بندے کو چاہیے کہ وہ بار بار، لمبے لمبے سجدے کرے، دعا کرے، روئے، گڑگڑائے، عاجزی و انکساری کرے، اللہ عز وجل کے سامنے جھکے، شاید اللہ اپنی رحمت کی نظر سے اس پر نظر کرے اور اسے ریاکاری کے وبال اور دکھاوے کے میل کچیل سے بچا لے۔ تاکہ اس کے اعمال توحید اور اخلاص کی بنیاد پر قائم ہوں۔

علم حاصل کرنے میں اخلاص یہ ہے کہ انسان صرف اس نیت سے علم حاصل کرے کہ پہلے اپنے آپ سے جہالت دور کرے اور پھر اپنے بھائیوں سے جہالت دور کرے۔ اے اللہ! ہمیں مخلصین میں شامل فرما، اے سارے جہانوں کے پروردگار! اے اللہ! ہمارے اعمال میں کسی کا حصہ نہ رکھ اے اللہ! ہمارے اعمال میں کسی کا حصہ نہ رکھ،اللہ کی قسم! اے میرے بھائیو! اگر زمین والے سب لوگ

تمہاری تعریف کریں لیکن آسمان والوں (یعنی اللہ اور فرشتوں) کے ہاں تم پر غضب ہو تو لوگوں کی تعریف تمہارے کسی کام نہیں آئے گی۔ اور اگر زمین والے سب لوگ تمہیں برا کہیں، تمہیں کمتر جانیں اور ایک ہی تیر سے تم پر طعن کریں لیکن تم اللہ عز وجل اور اہل آسمان کے نزدیک تعریف کے لائق ہو تو اللہ کی قسم! ان کی برائی تمہیں نقصان نہیں دے گی۔

یاد رکھو! جس کی تعریف زینت ہے اور جس کی مذمت نقصان ہے، وہ صرف اللہ تبارک وتعالیٰ ہے۔ لہٰذا خبردار! تمہارے دل کا کوئی شعبہ مخلوق کی نظر یا ان کے خیال سے جڑ نہ جائے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ شیطان پوری کوشش میں رہتا ہے کہ دل کو موڑ دے اور اس کی نظر کو مخلوق کی رعایت اور ان کی نگاہوں کی طرف پھیر دے۔ لیکن بندے پر لازم ہے کہ اس دل کے معاملے میں اللہ کی مدد لے۔ خبردار! اللہ عز وجل کی مدد طلب کرنے سے غافل نہ ہونا۔ ہم ان شاء اللہ تعالیٰ ان علمی نشستوں میں اس سب سے بڑی چیز کا مطالعہ کریں گے جو طالب علم کے علمی سفر میں حاصل کرنی چاہیے اور جس پر اس کی توجہ ہونی چاہیے، اور وہ ہے: دلیل کی تعظیم۔(یعنی قران،سنت و اجماع کی تعظیم)

اللہ کی قسم! تمہاری باتوں، تمہارے اعمال، تمہاری تصنیفات، تمہارے دروس و محاضرات، اور تمہارے شاگردوں کی تربیت میں برکت یقیناً دلیل کی تعظیم کے پیچھے ہے۔ پس جب تمہارا علم دلیل کی تعظیم پر قائم ہوگا تو اللہ کی بڑی برکت کی بشارت لو۔

تم بات کرو گے تو کان تمہاری بات کے سامنے جھک جائیں گے۔ تم راجح قول بیان کرو گے تو سینے کھل جائیں گے۔ تم درس یا محاضرات دو گے یا کتاب لکھو گے تو اللہ عز وجل اس کے لیے سات آسمانوں کے اوپر سے قبولیت نازل کرے گا۔

کیونکہ اعمال کی جنس یہی ہے۔ پس جو اللہ اور اس کے رسول کی بات کو عظیم بناتا ہے، اللہ عز وجل اس کی بات کو لوگوں کے دلوں میں عظیم بناتا ہے۔

اور میں گمان کرتا ہوں، اللہ بہتر جانتا ہے، کہ یہ بلند مرتبہ جو ابو العباس ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے حاصل کیا ہے — اور میں صرف انہی کو خاص نہیں کر رہا بلکہ ان سے پہلے بھی بہت سے علماء تھے — لیکن ابن تیمیہ کی شخصیت میں خاص طور پر میں سمجھتا ہوں کہ اللہ عز وجل نے انہیں لوگوں کے دلوں میں یہ عظیم مرتبہ اسی لیے عطا کیا کہ انہوں نے دلیل کی تعظیم کی۔

وہ ایسے زمانے میں پلے بڑھے جب تعصب اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ یہاں تک کہ جو کوئی معتمد مذہب کی فتویٰ کے خلاف بات کرتا، اسے قید میں ڈال دیا جاتا اور طویل عذاب دیا جاتا۔ لیکن اللہ عز وجل نے ابن تیمیہؒ کے لیے یہی مقدر کیا کہ وہ دلیل کو عظمت دیں اور اس زمانے میں دلیل کی عظمت کا پرچم بلند کریں۔

اور ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس وجہ سے بہت زیادہ تکالیف میں مبتلا ہوئے۔ انہیں بار بار قید کیا گیا، کیونکہ انہوں نے مشہور فتووں کی مخالفت کی۔ جب انہوں نے فتویٰ دیا کہ تین طلاقیں ایک ہی شمار ہوں گی اور اس طرح انہوں نے امام احمدؒ بن حنبلؒ کے مسلک بلکہ جمہور علماء کے مسلک کے خلاف بات کی، تو انہیں قید کر دیا گیا۔ بلکہ وہ جس ملک میں بھی گئے، وہاں کی قید و اذیت کا سامنا کیا۔ اسکندریہ میں قید کیے گئے، دمشق میں قید کیے گئے، مصر میں قید کیے گئے۔ یہ سب کچھ اس لیے کہ وہ دلیل پر کسی چیز کو مقدم نہیں کرتے تھے۔ چونکہ ابن تیمیہؒ کا دل ہر مقام اور ہر موقع پر دلیل کی تعظیم کرنے والا تھا، لہٰذا دیکھو ان کی کتابوں میں کتنی برکت ہے۔ دیکھو برکت کہاں تک پہنچی کہ جب کہا جاتا ہے ''شیخ الاسلام'' تو دل جھک جاتے ہیں، اور جب کہا جاتا ہے ''اسے شیخ الاسلام نے اختیار کیا'' تو دل مطمئن ہو جاتے ہیں۔ ہم ان کے بارے میں نہ تو عصمت کا عقیدہ رکھتے ہیں اور نہ ہی انہیں بشریت سے بلند مانتے ہیں، لیکن ہم اس سبب کو تلاش کرتے ہیں جس کی وجہ سے اللہ عز وجل نے انہیں یہ بلند مرتبہ عطا فرمایا، اور وہ سبب صرف ''دلیل کی تعظیم'' ہے۔ ابن تیمیہؒ کبھی بھی دلیل کو ذرا سا بھی موقع ملتے ہی نہیں چھوڑتے تھے، نہیں! بلکہ وہ ہر چیز کو دلیل کے لیے قربان کر دیتے۔ وہ دنیا اور اس کے تمام مال ومتاع کو ایک دلیل کے لیے چھوڑ دینے پر تیار تھے۔ اور یہی عظیم منہج ان کے شاگردوں کے شاگردوں نے بھی اختیار کیا۔ یہاں تک کہ ابن القیمؒ نے کہا:قسم ہے میری زندگی کی! ہمارے دلوں پر ہزار قاعدوں کو ڈھانا اس سے زیادہ آسان ہے کہ ہم ایک دلیل کو چھوڑ دیں۔''

یعنی ہزاروں قاعدے اگر دلیل کے خلاف ہوں تو انہیں توڑ دو، اور خبردار! کبھی ان پر عمل نہ کرو۔ یہ بھی ہمارے نزدیک دلیل کی تعظیم کے قاعدوں میں سے ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی زندگی کو دلیل کی تعظیم پر پروان چڑھائیں۔ اگر ہم اپنی عمر بھر کی تحقیق اور مطالعے سے صرف دلیل کی تعظیم ہی حاصل کر لیں تو یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ چاہے ہم بہت زیادہ یاد نہ کریں، چاہے ہم مسائل کو پوری طرح جمع نہ کریں، چاہے ہم بلند علمی مقام تک نہ پہنچیں۔ لیکن جب تک تم دلیل کی تعظیم کرتے ہو، تب تک تم علماء میں شمار ہوتے ہو۔

عالم وہی ہے جو دلیل کی تعظیم کرے، چاہے اس کا علمی سرمایہ کم ہو۔ لیکن جو شخص نے علم بہت جمع کر لیا ہو، لیکن معمولی موقع پر بھی دلیل کو چھوڑ دے، اپنے امام کی بات دلیل کے خلاف ہو تو دلیل کو پھینک دے، اپنے مذہب کی مشہور بات دلیل کے خلاف ہو تو دلیل کو چھوڑ دے، حاکم کی بات دلیل کے خلاف ہو تو دلیل کو چھوڑ دے، اپنے امام کی اتباع میں دلیل کو چھوڑ دے، اپنی عادت، عرف، رسم و رواج اور اپنی روایات دلیل کے خلاف ہوں تو دلیل کو چھوڑ دے — تو ایسا شخص حقیقت میں جاہل ہے، چاہے اس نے کتنا ہی علم جمع کر رکھا ہو۔

پس حقیقت میں علماء وہی ہیں جو دلائل کی تعظیم کرتے ہیں۔ اگر تم پوچھو ''اس کی دلیل کیا ہے؟'' تو میں کہتا ہوں: اللہ عز وجل کا فرمان ہے:

﴿وَيَرَى الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ الَّذِي أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ﴾

اور جنہیں علم دیا گیا ہے وہ دیکھتے ہیں کہ جو آپ کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے وہی حق ہے۔''

پس جو جان لے کہ اللہ نے جو دلیل نازل کی ہے وہی حق ہے اور اس علم کو اس طرح تقویت دے کہ وہ اس حق کو ہر اس چیز پر مقدم کرے جو حق نہیں، تو وہ قرآن کے نص کے مطابق عالم ہے۔ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: ''جو جان لے کہ اللہ نے جو دلیل نازل کی ہے وہی حق ہے، وہ عالم ہے۔''

پس اگر تم سے پوچھا جائے ''علم کیا ہے؟'' تو کہو: ''علم یہ ہے کہ تم جان لو کہ حق صرف دلائل میں منحصر ہے، اور جو چیز دلیل کے خلاف ہو وہ باطل ہے۔''

لہٰذا ہمیں چاہیے کہ اے بھائیو! ہم ہمیشہ اپنی تربیت کریں کہ دلائل کی تعظیم کریں، ان پر ہمیشہ عمل کریں، انہیں اپنے سروں کا تاج بنائیں، اور اس بات سے بہت بچیں کہ ہم کسی بھی دلیل کو ٹھکرائیں جس کی صحت ثابت ہو گئی ہو، خواہ وہ کسی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ حتیٰ کہ اگر وہ صحابی کا قول ہی کیوں نہ ہو۔

اس لیے علماء کا اجماع ہے کہ جب صحابی کا قول نبی کریم ﷺ کے مرفوع فرمان کے خلاف ہو تو وہ اجماعی طور پر حجت نہیں ہے۔ اور صحابہ سے کم درجہ والوں کا قول تو بدرجۂ اولیٰ حجت نہیں ہوگا۔

اے طلبۂ علم! اس بات سے بچو کہ تم دلیل کو رد کرو، یا اس کی دلالت میں شک پیدا کرو، یا اس پر عمل نہ کرنے کو آسان سمجھو، صرف اس لیے کہ اس کے مقابلے میں یا اس کے مخالف کوئی دوسری چیز ہے۔ اصل اعتبار دلیل کی تعظیم

ہی کا ہے۔ دلیل کی تعظیم کرو گے تو اللہ تمہیں اپنی زمین پر بلند کرے گا۔ دلیل کا احترام کرو گے تو اللہ تمہارے لیے دلوں کو کھول دے گا۔ ’’کیا احسان کا بدلہ احسان کے سوا کچھ ہے؟‘‘ اور بدلہ عمل کی جنس ہی سے دیا جاتا ہے۔

لیکن ہمارے اس زمانے میں، بلکہ اس سے پہلے بھی کچھ ایسے لوگ نمودار ہوئے جو کبھی دلیل کو دیکھتے ہی نہیں تھے۔ ان کی ساری توجہ صرف یہ ہوتی تھی کہ فلاں نے کیا کہا اور فلاں نے کیا کہا۔ وہ علماء کے اقوال کو بذاتِ خود دلیل بنا لیتے ہیں۔ ان کے دل اور ان کی آنکھیں اصل دلیل سے غافل رہتے ہیں، جو کہ اپنی ذات میں حجت ہے۔ وہ عالم کے قول کو جو محض تبعی حیثیت رکھتا ہے، اس اصل دلیل پر مقدم کر دیتے ہیں جو بذاتِ خود حجت ہے۔

اور ایسے لوگ اس زمانے میں بڑھ گئے ہیں، یہاں تک کہ ان میں سے کچھ گروہ فتوے دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، اور وہ صریح اور صحیح دلیل کے خلاف فتوے دیتے ہیں، صرف اس وجہ سے کہ اس مسئلے میں فلاں عالم کا قول موجود ہے۔ اس طرح انہوں نے دلیل کو چھوڑ کر کہا: چونکہ فلاں عالم نے ایسا کہا ہے اس لیے دلیل کے خلاف عمل جائز ہے۔

چنانچہ انہوں نے عورتوں کے بال جوڑنے (وصل) کو جائز قرار دیا، صرف اس لیے کہ کچھ علماء نے اس کے جواز کا قول کیا۔ اور انہوں نے نبی ﷺ کے ساتھ بدعی توسل کو جائز قرار دیا، صرف اس لیے کہ کچھ علماء نے اس کی اجازت دی۔ اور جب ان سے کہا گیا: ’’ادلہ کہاں ہیں؟‘‘ تو جواب دیا گیا: ’’اس مسئلے میں فلاں عالم نے ایسا کہا ہے۔‘‘

کیا یہ صحیح منہج ہے؟ اللہ کی قسم! یہ شیطانی منہج ہے۔ اور جو اس منہج پر امت کی تربیت کرے وہ حقیقت میں انسان کی شکل میں ایک شیطان ہے، کیونکہ وہ امت کو اس مطلق حق کی مخالفت پر تیار کر رہا ہے جو دلائل میں موجود ہے۔خوش نصیب ہے وہ جسے اللہ ایسے شخص کی طرف رہنمائی کرے جو اسے دلیل کی تعظیم پر پروان چڑھائے۔ کیونکہ جب بھی ہم اپنی نفوس کو اور اپنی خواہشات کو قابو میں کر کے دلیل کو ہر چیز پر مقدم کریں گے تو اللہ کی قسم ہم بڑی بھلائی میں ہوں گے۔ اور یہ جو دروس آج اور کل ان شاء اللہ منعقد ہو رہے ہیں، یہ سب ’’دلیل کی تعظیم‘‘ کے اصولوں پر مبنی ہیں۔ اور اس موضوع پر ایک پرانی رسالہ بھی موجود ہے جس کا نام ہے:

قواعد تعظيم الأدلة وحراستها

(یعنی: دلائل کی تعظیم اور ان کی حفاظت کے اصول)۔

اگر ہم دلائل کی حفاظت کرتے ہیں تو ہم دراصل اسلام، دین اور شریعت کی حفاظت کرتے ہیں۔ کیونکہ جب تک دلائل باقی رہیں گے اسلام باقی ہے، اور جب دلائل ختم ہو جائیں گے تو اسلام اور شریعت بھی ختم ہو جائیں گے۔ اسی لیے ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ لوگ نہ جانیں گے کہ روزہ کیا ہے، نماز کیا ہے، صدقہ کیا ہے اور قربانی کیا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ قرآن بھی ایک رات اٹھا لیا جائے گا، اور زمین پر ایک آیت بھی باقی نہ رہے گی۔ جب دلائل اٹھا لیے جائیں گے تو لوگ شریعت اور دین کو بھول جائیں گے۔ پھر وہ نہ نماز کی شرطیں جانیں گے، نہ نماز کے ارکان، نہ زکاۃ کی شرطیں، نہ حج کی شرطیں اور نہ ہی حج کی کیفیت۔ کیونکہ دلائل اٹھا لیے گئے ہوں گے۔

پس اے طلبۂ علم! مشرق و مغرب کے جہاں بھی ہو، اللہ سے ڈرو اور دلیل کے معاملے میں محتاط رہو۔ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ دلیل کی تعظیم کرو۔ دلیل کو اپنے سر کا تاج بنا لو، دلیل کو اپنے دل میں جگہ دو، اور علماء کے اقوال کو اپنے ہاتھ میں رکھو۔ تمہارے لیے سب سے آسان کام یہ ہونا چاہیے کہ اگر کسی عالم کا قول دلیل کے خلاف ہو تو اسے چھوڑ دو، کیونکہ تمہارے دل میں جو تاج ہے وہ دلیل ہے۔ خبردار! ایسا نہ ہو کہ علماء کے اقوال کو دل میں رکھو اور دلائل کو ہاتھ میں، اور جب علماء کے اقوال دلائل کے مخالف ہو جائیں تو دلائل کو پھینک دو۔ دلیل کی تعظیم تمہارے دل میں سب سے بڑی اور سب سے بلند مرتبے کی چیز ہونی چاہیے۔ کسی بھی عظمت کو دلیل کی عظمت کے برابر نہ ٹھہراؤ۔

یہ وہ قواعد ہیں جو ان شاء اللہ تم سنو گے، اور یہ سب دلائل اور اہلِ سنت کے اقوال کے ساتھ بیان کیے جائیں گے۔ میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جو اپنی علمی زندگی، نظر اور اجتہاد میں ان قواعد کو اختیار کرے گا وہ دلائل کی تعظیم کرنے والا بنے گا اور امت میں اس کا بڑا مقام ہوگا۔ یہ مقام وہ اپنی ذات سے حاصل نہیں کرے گا بلکہ اس لیے ملے گا کہ اس نے دلیل کی تعظیم کی۔ جس نے دلیل کی تعظیم کی، دلیل کا احترام کیا، دلیل کی قدر کی، دلیل کو محفوظ رکھا اور دلیل کے معنی و مفہوم کی حفاظت کی تو وہ باذن اللہ محفوظ بھی ہے، محبوب بھی ہے اور مکرم بھی ہے۔ اگرچہ دنیا والے اس کی توہین کریں، لیکن وہ اللہ کے نزدیک مکرم ہے۔ اس کی باتوں کے لیے دل کھل جاتے ہیں، اس کی تصنیفات سے دلوں کو روشنی ملتی ہے، اس کی ترجیحات کی طرف لوگوں کے دل مائل ہوتے

ہیں، اس کے اقوال امت میں ایسے چلتے ہیں جیسے دن اور رات چلتے ہیں۔ یہ سب کچھ دلیل کی تعظیم پر قائم ہے۔

آؤ میرے بھائیو! ہم ان عظیم قواعد کا ذکر شروع کریں جو تقریباً تیس کے قریب ہیں یا اس سے بھی زیادہ۔ ہم انہیں ایک ایک کرکے ان کے دلائل کے ساتھ لیں گے، اور شرح کے دوران میں علماء کے اقوال بھی بکثرت ذکر کروں گا تاکہ تمہارے کان یہ سن لیں کہ یہ سب قواعد دلیل اور اہل علم کے کلام سے ثابت ہیں۔ اور ان میں سے بعض قواعد ایسے ہوں گے جو براہِ راست قرآن کی آیات سے موافق ہوں گے، اس لیے وہ ایک قاعدہ بھی ہوں گے اور دلیل بھی۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے اچھا بیان کرنے کی توفیق دے، جو میں کہوں وہ حق اور اللہ کو پسندیدہ ہو، اور میرے کلام میں کسی کے لیے دکھلاوے یا ریا کا حصہ نہ ہو۔ میں اللہ سے تمہارے اور اپنے لیے اخلاص مانگتا ہوں، اور یہ بھی کہ تمہیں اچھا سننے، توجہ دینے اور لکھنے کی توفیق دے۔

یہ کتاب تمہیں ان شاء اللہ اس کورس کے آخر میں ایک نسخہ کی صورت میں مل جائے گی، جو کتب خانے میں رکھی جائے گی تاکہ جو چاہے اس کی نقل کر لے۔ کیونکہ یہ نہ مطبوعہ ہے اور نہ ہی ابھی تک انٹرنیٹ پر ڈالی گئی ہے۔

پہلا قاعدہ: يَآ اَيُّـهَا الَّـذِيْنَ اٰمَنُـوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّـٰهِ وَرَسُوْلِـهٖ ۖ-------

''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو۔''

یہی قاعدہ اس باب میں سب سے بڑی بنیاد ہے، سب سے عظیم اور سب سے بلند مرتبے کا ہے، اور اس کے بعد جتنے بھی قواعد ہیں وہ اسی سے نکلتے ہیں۔ جس نے اس قرآنی قاعدے کو بنیاد بنایا اور اس پر دین داری اختیار کی تو اس کے بعد باقی قواعد اس پر عمل کرنا آسان ہو جائیں گے ان شاء اللہ۔ اور سب کو معلوم ہے کہ یہ سورة الحجرات کی پہلی آیت ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو سب سے محبوب صفت کے ساتھ پکارا: ''اے ایمان والو۔'' اس میں ایک خوبصورت نکتہ ہے کہ ہر وہ آیت جو ''اے ایمان والو'' سے شروع ہو تو اس کے بعد جو حکم آتا ہے وہ ایمان کا تقاضا ہوتا ہے۔ مثلاً يَآ اَيُّـهَا الَّـذِيْنَ اٰمَنُـوْا تُوْبُـوٓا اِلَى اللّـٰهِ ''اے ایمان والو! توبہ کرو'' تو اس کا مطلب ہے کہ توبہ ایمان کی شاخوں میں سے ہے۔

يَآ اَيُّـهَا الَّـذِيْنَ اٰمَنُـوْا لَا تَـرْفَعُـوٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ

’’اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی کی آواز سے بلند نہ کرو‘‘ یہ ایمان کا دوسرا تقاضا ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا ---------------َ﴾(سورة الحج: 77)

’’اے ایمان والو! رکوع اور سجدہ کرو‘‘ تو اس کا مطلب ہے کہ نماز ایمان کے تقاضوں میں سے ہے۔

پس ہر چیز جو اللہ تعالیٰ نے ’’اے ایمان والو‘‘ کے بعد ذکر کی ہے وہ ایمان کے تقاضوں میں سے ہے۔ اسی طرح ’’اے ایمان والو! نبی پر درود بھیجو‘‘ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا بھی ایمان کے تقاضوں میں سے ہے۔ علماء نے ایمان کے تقاضوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے: ایک وہ جو فرضِ عین اور واجب ہیں، اور دوسرے وہ جو سنت اور نفل کے درجے میں ہیں۔ لہٰذا اس آیت کو ایمان کے وصف کے ساتھ شروع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مومن کی واجب صفات میں سے یہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھے۔ یہ ایمان کے حقائق میں سے ہے، اور ایسا ایمان ہے جس کے بغیر قیامت کے دن نجات ممکن نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے آگے نہ قول میں، نہ رائے میں، نہ مکتبہ فکر میں، نہ عقل میں، نہ قیاس میں اور نہ ہی کسی بھی چیز میں آگے بڑھا جائے۔ یہ ایک کبیرہ گناہ ہے کہ آدمی اللہ اور اس کے رسول سے آگے بڑھے، اور یہی حقیقت دلیل کی تعظیم کی بنیاد ہے۔ ایک ہی آیت نے تعظیمِ دلیل کے سارے قواعد کو جمع کر دیا ہے: ’’اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو۔‘‘ نہ قول میں، نہ عقل میں، نہ رائے میں، نہ اجتہاد میں، نہ خواہشات میں، نہ عادتوں میں، نہ رسوم و رواج میں اور نہ ہی کسی روایت میں۔ خبردار! اللہ اور اس کے رسول کے آگے کسی بھی چیز میں نہ بڑھو۔

دلیل ہی اصل ہے جو مقدم ہے، اور اس کے سوا باقی سب مؤخر ہیں۔

علمِ اصول کے علماء رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ کسی چیز کا حکم دینا اس کے مخالف سے منع کرنا ہوتا ہے۔ اور علماء رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ "مخالفت کا مفہوم" بھی شرعاً حجت ہے۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ قطعی حکم دیا کہ ہم اس کے آگے کسی چیز میں سبقت نہ کریں تو یہ دراصل ایک ضمنی حکم ہے کہ ہم باقی سب چیزوں کو پیچھے ڈال دیں۔ لہٰذا ہر چیز کو اپنے پیچھے پھینک دینا ضروری ہے یہاں تک کہ دلیل سامنے آجائے۔ اگر وہ چیز دلیل کے موافق ہوئی تو ہم اسے پیچھے سے اٹھا کر لائیں گے اور قبول کریں گے۔ اور اگر دلیل کے مخالف ہوئی

تو ہم اسے اپنے پیچھے پھینک دیں گے، نہ اس کی پروا کریں گے اور نہ ہی اسے کسی درجہ اعتبار سے دیکھیں گے۔

کیا تم غور نہیں کرتے کہ یہ آیت کتنی مختصر ہے، مگر اس نے پورا درس سمیٹ لیا ہے: دلیل مقدم ہے اور باقی سب مؤخر۔ دلیل ہی وہ ترازو ہے جس میں اقوال، اعمال، مذاہب اور اجتہادات تولے جاتے ہیں، اور باقی سب کچھ بھی تولا جانے والا ہے۔

پس جس نے اپنے مذہب کو دلیل پر مقدم کر دیا اس نے دلیل کی تعظیم نہیں کی۔ جس نے اپنے امام کی رائے کو دلیل پر مقدم کر دیا اس نے دلیل کی تعظیم نہیں کی۔ جس نے اپنے ناقص عقل یا فاسد قیاس کو دلیل پر مقدم کر دیا اس نے دلیل کی تعظیم نہیں کی۔یہ قاعدہ ان سب کو ختم کر دیتا ہے۔

دلیل ہی سب سے پہلا، سب سے بڑا سردار، سب سے زیادہ واجب الاتباع اصل ہے۔ یہی وہ تاج ہے جسے سر پر رکھنا چاہیے۔ یہی ترازو ہے، یہی سب سے قوی ہے، اور باقی سب اس کے تابع غلام ہیں۔ باقی سب شاخ ہیں اور دلیل اصل ہے۔ باقی سب تولا جانے والا ہے اور اگر نصوص کے خلاف ہو تو سب سے کمزور ہے۔لہٰذا ہمارے لیے جائز نہیں کہ صحیح دلیل پر کسی چیز کو مقدم کریں، اگر ہم واقعی دلیل کی تعظیم کرنا چاہتے ہیں۔

امام شنقیطی رحمہ اللہ نے اللہ کے اس قول **"لا تقدموا بين يدي الله ورسوله"** (اللہ اور اس کے رسول کے آگے سبقت نہ کرو) کے بارے میں فرمایا:

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے آگے مت بڑھو۔ کسی معاملے میں علم یا اللہ کی اجازت کے بغیر کچھ نہ کہو۔ یہ عظیم آیت اس بات پر صریح منع کرتی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے آگے کسی چیز میں سبقت کی جائے۔اور اس میں سب سے پہلے یہ داخل ہے کہ کوئی ایسا حکم گھڑ لیا جائے جسے اللہ نے نہیں بنایا، یا کسی چیز کو حرام کر دیا جائے جسے اللہ نے حرام نہیں کیا، یا کسی چیز کو حلال کہہ دیا جائے جسے اللہ اور اس کے رسول نے حلال نہیں کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ حرام صرف وہ ہے جسے اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا، اور حلال صرف وہ ہے جسے اللہ اور اس کے رسول نے حلال کیا۔ اور دین صرف وہ ہے جسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے مشروع کیا۔

بعض اہل علم رحمہم اللہ نے اس آیت کے بارے میں کہا کہ اللہ اپنے مؤمن بندوں کو ادب سکھاتا ہے اور انہیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ رسول ﷺ سے خطاب اور معاملہ کیسے کرنا ہے اور ان کا حق کیسے ادا کرنا ہے جس میں کامل توقیر اور احترام شامل ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے ایمان والو! دیکھو، جلدبازی نہ کرو۔

کسی معاملے میں فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کرو جب تک رسول اللہ ﷺ اس میں تمہارے لیے فیصلہ نہ کر لیں۔

تم اللہ اور اس کے رسول کے فیصلے کے تابع رہو۔ کسی معاملے میں اس وقت تک نہ بولو جب تک رسول اللہ ﷺ اس میں کلام نہ فرما لیں۔ اور کوئی کام اس وقت تک نہ کرو جب تک رسول ﷺ نہ کر لیں۔

اور اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو۔ بے شک وہ تمہارے اقوال کو سنتا ہے اور تمہارے اعمال کو جانتا ہے۔

پس اللہ ہمیں کہہ رہا ہے: اے وہ لوگو جو ایمان لائے! خبردار رہو کہ تم احکام میں جلدبازی نہ کرو، کوئی بات نہ کہو یا کوئی کام نہ کرو جس پر شرعی دلیل موجود نہ ہو۔ اسی پر اللہ کا فرمان ہے: "أم لهم شركاء شرعوا لهم من الدين ما لم يأذن به الله"(کیا ان کے ایسے شریک ہیں جنہوں نے ان کے لیے ایسا دین گھڑ لیا جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی؟)

زمخشری نے کہا (اللہ ہم سے اور ان سے درگزر فرمائے): اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بات کاٹ کر حتمی نہ کہو سوائے اس کے جس کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسول کریں اور اس کی اجازت دیں۔

امام انوسی رحمہ اللہ نے فرمایا:کسی معاملے کو حتمی طور پر نہ کہو، نہ ہی اس پر جزم کرو اور نہ ہی اس پر عمل کرنے کی جرات کرو جب تک اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ اس میں فیصلہ نہ فرما دیں اور اجازت نہ دیں۔

خلاصہ یہ کہ یہ آیت کسی بھی معاملے میں اقدام کرنے سے منع کرتی ہے جب تک کتاب و سنت کی نظائر اور مثالیں اس پر شاہد نہ ہوں۔

امام ابن سعدی رحمہ اللہ نے فرمایا:یہ آیت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ ادب، تعظیم، احترام اور تکریم پر مشتمل ہے۔

اللہ نے اپنے مؤمن بندوں کو حکم دیا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان کے تقاضوں کو پورا کریں، اللہ کے اوامر کی اطاعت کریں اور اس کی نواہی سے بچیں، اور اللہ اور اس کے رسول کے آگے سبقت نہ کریں۔

نہ کوئی بات کریں جب تک رسول ﷺ نہ کہیں، نہ کوئی حکم دیں جب تک رسول ﷺ نہ دیں۔ یہی حقیقت میں وہ ادب ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ واجب ہے۔ یہی بندے کی سعادت، فلاح اور تقویٰ کی علامت ہے۔

انہوں نے فرمایا: اگر یہ چیز چھوٹ جائے تو اس کے ساتھ ابدی سعادت اور دائمی نعمت بھی چھن جاتی ہے۔ (کلام ختم ہوا)

میں کہتا ہوں: یہی وہ طریقہ ہے جس پر اہل سنت والجماعت کے دل مجتمع ہوئے ہیں اور جسے انہوں نے اپنی عقیدے کی کتابوں میں درج کیا ہے، کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے کلام پر کسی انسان کا کلام مقدم نہیں کرتے، خواہ وہ کوئی بھی ہو۔

علامہ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں، اور میں نے ان کا کلام آخر میں ذکر کیا تاکہ پہلے کا کلام اس کی تفسیر بن جائے:

"نہ کچھ کہو جب تک وہ نہ کہیں، نہ کچھ حکم دو جب تک وہ حکم نہ دیں، نہ کوئی فتویٰ دو جب تک وہ فتویٰ نہ دیں، اور نہ کسی معاملے کا فیصلہ کرو جب تک وہ فیصلہ نہ فرما دیں اور اسے نافذ نہ کریں۔"(ان کا کلام ختم ہوا)

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ’’اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کے آگے مت بڑھو۔‘‘

یہ ایک نہی ہے (یعنی ممانعت ہے)۔ اور علماء کے اصولی قواعد میں سے ہے کہ جو نہی کسی قرینے کے بغیر ہو وہ تحریم (یعنی سخت ممانعت و حرمت) پر دلالت کرتی ہے۔ اور اسی پر چاروں ائمہ اور دیگر اہل علم کے اقوال متفق ہیں۔ میں آپ کے سامنے ان میں سے کچھ پیش کرتا ہوں۔

امام مالک رحمہ اللہ نے ایک عظیم قاعدہ فرمایا جو ان شاء اللہ ہمارے سامنے آئے گا: ’’ہمارے سب اقوال رد بھی ہو سکتے ہیں اور قبول بھی، سوائے اس ذات کے قول کے جو اس قبر (نبی کریم ﷺ کی قبر مبارک) میں ہیں۔‘‘ یہی ہے ’’اللہ اور رسول کے آگے مت بڑھو‘‘ کا مطلب۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ’’جب حدیث صحیح ہو تو وہی میرا مذہب ہے۔‘‘

وہ ایک اور مشہور بات کہتے ہیں جو سونے کے پانی سے لکھے جانے کے قابل ہے: ’’اگر میرا قول رسول اللہ ﷺ کے قول کے خلاف ہو تو رسول اللہ ﷺ کے قول کو لے لو اور میرے قول کو دیوار پر دے مارو۔‘‘ یہی ہے ’’اللہ اور رسول کے آگے مت بڑھو‘‘ کا مطلب۔

وہ یہ بھی کہتے ہیں: ’’مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ جسے رسول اللہ ﷺ کی سنت ظاہر ہو جائے، اس کے لیے کسی بھی انسان کا قول چھوڑ کر سنت کو لینا لازم ہے، چاہے وہ شخص کوئی بھی ہو۔‘‘ یہی اس قاعدے کا مطلب ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ’’مجھے ان لوگوں پر تعجب ہے جو سند اور اس کی صحت کو جانتے ہیں، پھر بھی سفیان (ثوری) کی رائے کو لے لیتے ہیں۔‘‘ یعنی وہ سند اور حدیث کو چھوڑ دیتے ہیں اور ایک شخص کی رائے کو ترجیح دیتے ہیں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جب حجِ تمتع کے مسئلے میں مناظرہ ہوا تو انہوں نے فرمایا: ’’قریب ہے کہ تم پر آسمان سے پتھر برسیں! میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے اور تم کہتے ہو کہ ابو بکر و عمر نے فرمایا ہے۔‘‘

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ’’اگر قول رسول اللہ ﷺ سے آئے تو وہ آنکھوں پر ہے۔ اگر صحابہ کا قول آئے تو وہ بھی آنکھوں پر ہے۔ اور اگر تابعین کا قول آئے تو ہم بھی مرد ہیں اور وہ بھی مرد ہیں۔‘‘ یعنی ان کا قول ہمارے اوپر حجت نہیں ہے۔

یہی ہے اصل علم، اور یہی ہے ائمہ کا مقام، اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انہیں زمین میں مضبوطی عطا فرمائی۔ اسی طرح دلیل کو عظمت دینا چاہیے۔ پس تمام ائمہ، جیسا کہ ہمیں معلوم ہے، سختی سے اس بات سے منع کرتے ہیں کہ ان کے اقوال کو لیا جائے جب وہ قرآن و سنت کے خلاف ہوں۔ اور جان لو، اللہ تم پر رحم کرے، کہ دلائل کو دوسروں کے اقوال پر مقدم رکھنا کوئی اختیاری چیز نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم پر فرض ہے۔ اللہ نے فیصلہ کیا ہے کہ تم پر یہی واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۗ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا ،،، سورة الأحزاب (33:36) ’’کسی مومن مرد اور عورت کے لیے یہ جائز نہیں کہ جب

اللہ اور اس کا رسول کوئی فیصلہ فرما دیں تو ان کے پاس اپنے معاملے میں کوئی اختیار باقی رہے۔‘‘ اور فرمایا

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا : سورة النساء (4:65) ’’پس نہیں، تیرے رب کی قسم! وہ ایمان والے نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ اپنے جھگڑوں میں آپ ﷺ کو فیصلہ کرنے والا نہ مانیں، اور پھر اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں، اور پورا پورا تسلیم کر لیں۔‘‘ اور فرمایا: وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ ’’جس چیز میں تم اختلاف کرو اس کا فیصلہ اللہ کے سپرد ہے۔‘‘ اور فرمایا: فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ’’اگر تم کسی معاملے میں اختلاف کرو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔‘‘

یہ سب باتیں ایک ہی جملے میں جمع ہو جاتی ہیں: ’’اللہ اور رسول کے آگے مت بڑھو۔‘‘

پس شریعت کے قول کے مقابلے میں کسی بھی چیز کو پیش کرنا جائز نہیں، چاہے تمہارے دل میں اپنے امام کی کتنی ہی عظمت کیوں نہ ہو۔ چاہے اس کی علم میں کتنی ہی رفعت کیوں نہ ہو۔ چاہے تم اسے کتنی ہی محبت کرتے ہو۔ یہ سب کچھ تمہیں یہ اجازت نہیں دیتا کہ اس کے قول کو صحیح دلیل پر مقدم کر دو۔ اس سے بچو اور خوب بچو۔ جب تک اس کا قول دلائلِ شرعیہ کے مخالف ہے تو تم پر لازم ہے کہ اس کے قول کو چھوڑ دو، کیونکہ شارع (اللہ اور رسول) کا قول سب سے زیادہ مقدم ہے

ایسا عالم جس نے دلیل کو چھوڑ دیا تاکہ اپنے امام کی بات مانے، اس میں کوئی خیر نہیں۔ اور ایسا طالب علم جس نے دلیل کو چھوڑ دیا تاکہ اپنے مذہب سے ٹکرا نہ جائے، اس میں بھی کوئی خیر نہیں۔ اسی لیے علماء نے متفقہ طور پر اس قول پر نکیر کی ہے جو بعض احناف رحمہ اللہ سے منقول ہے (اور میں اس کا نام نہیں لینا چاہتا) کہ: ’’ہمارا اصل یہ ہے کہ جو بھی دلیل ہمارے امام کے قول کے خلاف ہو وہ یا تو مؤول ہے یا منسوخ۔‘‘(اصول کرخی) کیا ہی بڑی خطرناک بات ہے یہ!

اصل یہ ہے کہ جو قول امام کے قول کے خلاف ہو وہ مؤول یا منسوخ ہے! جو خیر حقیقی چاہتا ہے اور جو خالص علم چاہتا ہے، اس پر لازم ہے کہ وہ دلیل کو سب پر مقدم رکھے اور دلیل پر کسی چیز کو مقدم نہ کرے۔

جب تم یہ قاعدہ، اس کی دلائل اور اہل علم کے اقوال کو جان لو، تو اب ہم اس پر کچھ عملی فروع لیں گے تاکہ اس کا عملی استعمال بھی واضح ہو جائے

پہلا فرع یہ ہے کہ اہل علم کا اجماع ہے کہ صحابی کا قول حجت نہیں ہے اگر وہ رسول اللہ ﷺ کے قول کے خلاف ہو۔ اور ہم نے صحابہ کو سب سے بڑے علماء مانا ہے رسول اللہ ﷺ کے بعد۔ اگر ان بلند مرتبہ صحابہ کا قول بھی رسول اللہ ﷺ کے قول کے خلاف ہو تو وہ حجت نہیں، تو پھر بتاؤ ان کے علاوہ کسی اور کا قول کیسے حجت ہو سکتا ہے؟! یقیناً ان کا قول بدرجہ اولیٰ حجت نہیں ہوگا۔

پس ہر وہ قول جو صحابی سے ثابت ہے لیکن وہ رسول اللہ ﷺ کے قول کے خلاف ہے تو وہ کبھی بھی حجت نہیں ہوگا اور نہ ہی اس پر اعتماد کیا جائے گا۔ بلکہ لازم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے قول کو مقدم رکھا جائے۔کیونکہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہم سے یہ نہیں پوچھے گا کہ ''تم نے صحابہ کو کیا جواب دیا؟'' بلکہ یہ پوچھے گا: مَاذَا أَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِينَ''تم نے رسولوں کو کیا جواب دیا؟' '

اسی لیے ہم عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اس قول کو نہیں لیتے کہ بڑے حدث (جنابت) کو تیمم سے زائل نہیں کیا جا سکتا جب پانی میسر نہ ہو۔ ابن مسعود کا کہنا تھا کہ تیمم چھوٹے حدث کے لیے تو مفید ہے، لیکن بڑے حدث کے لیے نہیں، بلکہ آدمی پانی ملنے تک نماز نہ پڑھے۔ کیا ہم اس قول کو لیں گے؟ جواب ہے: نہیں۔

وہ کیا چیز ہے جو ہمیں ان کے اس قول کو قبول نہ کرنے پر مجبور کرتی ہے، باوجود اس کے کہ ہمارے دلوں میں ابن مسعود کے لیے عظیم محبت اور احترام ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ(النساء)''اگر تم نے عورتوں سے مباشرت کی اور پانی نہ پایا تو پاک مٹی سے تیمم کرلو۔'' اور یہاں مباشرت سے مراد جماع ہے۔

اور صحیح بخاری و صحیح مسلم میں عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے ایک کام کے لیے بھیجا، اس دوران مجھے جنابت لاحق ہوگئی اور پانی نہ ملا۔ تو میں زمین پر ایسے لوٹنے لگا جیسے جانور لوٹتے ہیں۔ یہ قیاس تھا مگر ظاہر ہے کہ باطل قیاس، کیونکہ یہ نص کے ٹکرانے والا تھا۔ اس نے یہ سمجھا کہ چونکہ جنب کو پورے بدن پر پانی بہانا ہوتا ہے تو تیمم

میں بھی پورے بدن کو مٹی میں لوٹانا چاہیے۔ مگر یہ قیاس غلط ہے، کیونکہ بدل اپنے اصل کے حکم میں ہوتا ہے، نہ کہ اس کی صفت میں۔

پھر عمار رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور سارا واقعہ بیان کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمہارے لیے کافی تھا کہ یوں کرتے'' اور آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر مارے اور ایک ہی بار دونوں ہاتھوں سے چہرے اور ہاتھوں کا مسح کیا۔

تو اب بتائیے ہم ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول کیسے لے سکتے ہیں جبکہ وہ اس نص کے مخالف ہے؟

اور صحیح بخاری و مسلم میں عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو دیکھا جو لوگوں کے ساتھ نماز نہیں پڑھ رہا تھا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''اے فلاں! تمہیں کس چیز نے روکا کہ ہمارے ساتھ نماز نہیں پڑھی؟'' اس نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! مجھے جنابت لاحق ہوئی اور پانی میسر نہ تھا۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو پھر تمہارے لیے مٹی کافی ہے، وہ تمہیں پاک کردے گی۔''

ان واضح اور صحیح احادیث کے ہوتے ہوئے ہمیں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول کو قبول نہیں کرنا چاہیے، چاہے وہ جلیل القدر صحابی ہوں اور ہمارے دلوں میں ان کے لیے بے پناہ محبت اور احترام ہو۔ لیکن یاد رہے، عالم کا احترام ایک چیز ہے اور اس کے قول کو لینا دوسری چیز ہے۔ کسی عالم کی عظمت اور محبت ہمیں یہ اجازت نہیں دیتی کہ ہم اس کا قول لیں اگر وہ نص کے خلاف ہو۔ اسی طرح یہ بھی درست نہیں کہ نص کے خلاف اس کا قول رد کرنے کو ہم اس کی بے ادبی یا تنقیص کا ذریعہ بنائیں۔ یہی وہ بات ہے جسے ہم دین سمجھ کر مانتے ہیں۔

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی شروع میں ابن مسعود ہی کی رائے رکھتے تھے۔ اسی لیے ایک سفر یا مہم میں عمار اور عمر دونوں کو جنابت لاحق ہوگئی۔ عمار تو مٹی میں لوٹنے لگے جیسے جانور لوٹتے ہیں، اور عمر کئی دن تک نماز نہ پڑھتے رہے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ بڑے حدث کے لیے تیمم کافی نہیں۔ لیکن بعد میں عمر رضی اللہ عنہ اس رائے سے رجوع کر گئے، البتہ ابن مسعود کے رجوع کا ثبوت نہیں ملتا۔

اسی واقعے میں عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ جب صحابہ کے سامنے یہ حدیث بیان کرتے تو یہ خبر عمر تک بھی پہنچی جو اس وقت خلیفہ تھے۔ انہیں بتایا گیا

کہ عمار تمہارے بارے میں یہ حدیث بیان کرتے ہیں۔ عمر کو واقعہ یاد نہ رہا تھا۔ انہوں نے عمار کو بلایا اور پوچھا: ''یہ کب ہوا تھا؟'' عمار نے کہا: ''اے امیرالمؤمنین! کیا آپ کو یاد نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے اور آپ کو بھیجا تھا اور یہ واقعہ پیش آیا تھا؟'' عمر نے کہا: ''مجھے یاد نہیں۔'' عمار نے کہا: ''اگر آپ چاہیں تو میں یہ حدیث بیان نہ کروں۔'' عمر نے فرمایا: ''نہیں، بلکہ بیان کرو، تم اس کے ذمہ دار ہو۔'' اس کے بعد عمار اپنی روایت میں عمر کا نام نہیں لیتے تھے بلکہ صرف یہ کہتے تھے: ''مجھے رسول اللہ ﷺ نے بھیجا۔'' حالانکہ اصل میں اس مہم میں عمر بھی ساتھ تھے۔

تو معلوم ہوا کہ ہم ابن مسعود کے اس قول کو نہیں لیتے، کیوں؟ اس لیے کہ وہ نص صریح اور صحیح کے خلاف ہے۔

اسی فرع کی ایک اور مثال: صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم میں اختلاف ہوا اور ان کا دور ختم ہوگیا مگر اختلاف باقی رہا۔ بعد میں امت نے اجماع کر لیا کہ اگر آدمی اپنی بیوی سے جماع کرے لیکن انزال نہ ہو تو اس پر غسل واجب ہے۔ یہ رائے مہاجرین کی تھی جبکہ انصار کہتے تھے کہ غسل نہیں ہے بلکہ صرف وضو ہے۔

صحیح مسلم میں اُبی رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ مہاجرین اور انصار اس مسئلے میں جھگڑ پڑے۔ مہاجرین نے کہا: ''غسل واجب ہے'' اور انصار نے کہا: ''نہیں، غسل نہیں۔'' پھر انہوں نے مجھے عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھیجا۔ میں نے کہا: ''اے اماں جان! لوگوں میں فلاں مسئلے پر اختلاف ہے، آپ کیا کہتی ہیں؟'' انہوں نے کہا: ''تم جانکار کے پاس آئے ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب مرد بیوی کے چار حصوں کے درمیان بیٹھے اور دونوں شرمگاہیں آپس میں مل جائے تو غسل واجب ہو جاتا ہے۔'اسی پر صحیح بخاری و مسلم کی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے: ''جب مرد عورت کے چاروں حصوں کے درمیان بیٹھ جائے اور سخت محنت کرے تو غسل واجب ہو جاتا ہے، چاہے انزال نہ بھی ہو۔'' مسلم میں اضافہ ہے: ''اگرچہ انزال نہ ہو۔''صحیح مسلم میں عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور پوچھا: ''اے اللہ کے رسول! اگر آدمی بیوی سے جماع کرے اور انزال نہ ہو تو کیا غسل واجب ہے؟'' اور اس وقت عائشہ پاس بیٹھی تھیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں، میں اور یہ (عائشہ) ایسا کرتے ہیں اور پھر غسل کرتے ہیں۔''

اور سنن ابی داود میں اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کی روایت صحیح سند کے ساتھ موجود ہے کہ ’’شروع اسلام میں یہ رخصت تھی کہ غسل صرف انزال پر واجب ہوتا تھا، پھر یہ حکم منسوخ ہوگیا۔‘‘اور صحیح مسلم کی حدیث ابو رافع میں ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے مجھے بلایا جبکہ میں اپنی بیوی کے پیٹ پر لیٹا ہوا تھا، تو میں اٹھا اور غسل کیا، پھر نکلا اور میرے سر سے پانی ٹپک رہا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: شاید ہم نے تمہیں جلدی میں بلایا ہے؟ میں نے کہا: نہیں یا رسول اللہ۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم پر کوئی گناہ نہیں تھا اگر تم صرف وضو کر لیتے۔ (یہاں تک حدیث ختم ہوئی)۔ ابو رافع کہتے ہیں: پھر رسول اللہ ﷺ نے ہمیں غسل کا حکم دیا۔

پس جب یہ بات واضح ہوئی کہ ’’الماء من الماء‘‘ (پانی صرف انزال کے ساتھ واجب ہے) والی حدیث، جو کہ ابو سعید کی روایت ہے اور امام مسلم نے اپنی صحیح میں اسے ذکر کیا ہے اور امام بخاری نے اسے اپنے صحیح میں تعلیقاً، اور وہ بھی جزم کے ساتھ، موقوف صورت میں ذکر کیا ہے، تو یہ صرف رخصت تھی جو اسلام کے ابتدائی دور میں دی گئی تھی، پھر اس کے بعد نبی ﷺ نے غسل کا حکم دیا۔

تو اللہ کی قسم! کیا ہم اس صحابی کے قول کو قبول کریں گے جو یہ کہے کہ اگر کسی نے جماع کیا اور انزال نہ ہوا تو صرف وضو کافی ہے اور غسل لازم نہیں؟ جواب: نہیں۔

ہم اس کا قول کیوں چھوڑتے ہیں حالانکہ وہ صحابی ہے؟ اس لیے کہ ہم اللہ اور اس کے رسول کے سامنے کسی کا قول پیشگی نہیں رکھ سکتے۔ "لا تقدموا بين يدي الله ورسوله" (اللہ اور اس کے رسول کے آگے نہ بڑھو)۔

پس جب یہ حکم صحابہ کے بارے میں ہے کہ ان کا قول بھی نص کے مقابلے میں مردود ہے، تو جو لوگ صحابہ سے کم درجے کے ہیں ان کا حال اس سے زیادہ اولیٰ ہے کہ ان کے اقوال بھی نص کے مقابلے میں مردود ہوں گے۔

اے طالب علم! تجھے چاہیے کہ جب بھی کسی عالم کے قول کو نص کے خلاف پائے تو اس کی عظمت اور شان کو دیکھ کر نص کو نہ چھوڑ دے، کیونکہ اللہ کا قول ہر ایک کے قول سے بڑا ہے۔ لہٰذا کسی عالم یا امام کی مخالفت کو صرف اس لیے نہ چھوڑنا کہ اس کا مرتبہ بڑا ہے، کیونکہ نص مقدم ہے۔

سنو! اسی کی مثال تیسری دلیل میں ہے، اسی فرع کے اندر، کہ صحابی کا قول بذات خود حجت نہیں ہے۔

ایک عورت تھی جو نبی ﷺ کے زمانے میں حاملہ تھی، اس کا نام سبیعہ اسلمیہ تھا۔ اس کا شوہر فوت ہوگیا۔ اللہ نے مقدر کیا کہ اس کا شوہر اس کے حمل کے آخری مہینوں میں فوت ہوا۔ وہ عورت اپنے شوہر کی وفات کے چند راتوں بعد ہی بچہ جن گئی۔ امام زہری کی روایت میں ہے کہ وہ اپنے شوہر کی وفات کے چالیس دن بعد بچہ جن گئی۔ اب سوال پیدا ہوا: کیا اس کی عدت ختم ہوگئی یا نہیں؟ اس مسئلے میں صحابہ کرام میں اختلاف ہوا۔ اگر عورت چار مہینے اور دس دن سے پہلے بچہ جن دے تو کیا عدت ختم ہو جائے گی یا اسے چار مہینے اور دس دن پورے کرنے ہوں گے؟ صحابہ میں سے بعض کا قول یہ تھا، جن کے سردار علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں اور ان کے ساتھ دوسرے صحابہ بھی، کہ عورت کو دونوں میں سے طویل مدت پوری کرنی ہوگی۔ اگر وہ چار مہینے پورے ہونے سے پہلے بچہ جن دے تو بھی اسے چار مہینے اور دس دن تک عدت گزارنی ہوگی، اور اگر چار مہینے اور دس دن گزر جائیں لیکن حمل باقی ہے تو اسے حمل کی ولادت تک عدت گزارنی ہوگی۔لیکن ہم یہ قول قبول نہیں کرتے۔ کوئی کہے: ''اللہ سے ڈرو، تم کیسے نہیں قبول کرتے حالانکہ یہ صحابہ کرام کا قول ہے؟'' تو ہم کہتے ہیں: جی ہاں! ان کی عزت و توقیر اپنی جگہ ہے، لیکن ہم اسے اس لیے نہیں مانتے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی صحیح مرفوع حدیث کے خلاف ہے۔

اسی لیے ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک عورت جس کا نام سبیعہ تھا، اور وہ قبیلہ اسلم سے تعلق رکھتی تھی، وہ اپنے شوہر کے نکاح میں تھی۔ اس کا شوہر فوت ہوگیا اور وہ عورت حاملہ تھی۔ پھر اس نے چند راتوں بعد بچہ جنا۔ اس نے نبی ﷺ سے اجازت مانگی کہ کیا وہ نکاح کرسکتی ہے؟ نبی ﷺ نے اسے اجازت دی، پس اس نے نکاح کر لیا۔

یہ صریح اور قطعی نص ہے کہ اگر کسی عورت کا شوہر فوت ہو جائے اور وہ حاملہ ہو تو اس کی عدت ولادتِ حمل کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔

اور آپ کے پاس ایک اصول ہے کہ ''حمل باقی سب عدتوں پر غالب ہے''۔ حمل، حیض سے بھی مقدم ہے، مہینوں کی عدت سے بھی مقدم ہے، اور شریعت کی طرف سے مقرر کردہ تمام عدتوں پر غالب ہے۔

لہٰذا اگر مطلقہ عورت حاملہ ہے تو اس کی عدت صرف وضعِ حمل ہے۔ اور مطلقہ کے لیے حیض کی عدت کا اعتبار نہیں رہتا۔

پس اگر ایک عورت کا شوہر ظہر کے وقت فوت ہو جائے اور وہ عصر کے وقت بچہ جن دے، یا شوہر کے انتقال کے صرف بیس منٹ بعد اسے لیبر روم میں داخل کیا گیا اور بچہ پیدا ہو گیا، تو اس عورت کی عدت ختم ہو گئی۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَأُوْلَٰتُ ٱلۡأَحۡمَالِ أَجَلُهُنَّ أَن يَضَعۡنَ حَمۡلَهُنَّۚ " (حاملہ عورتوں کی عدت یہ ہے کہ وہ اپنا حمل وضع کر دیں)۔

یہی وہ بات ہے جس پر ہم دین داری کے ساتھ یقین رکھتے ہیں۔

پس جب دلیل بالکل واضح ہو جائے تو نہ کسی صحابی کے قول کو، نہ کسی بڑے عالم کے قول کو، نہ ابن عباسؓ کے قول کو، اور نہ ہی کسی اور کے قول کو، رسول اللہ ﷺ کے فرمان پر مقدم رکھنا جائز ہے۔

فرعِ ثانی:

اور اب میں اس قاعدے میں کچھ طول دوں گا۔

یقیناً ہم سب ائمہ اربعہ (امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد رحمہم اللہ) کی تعظیم کرتے ہیں، کیا ایسا نہیں؟ ہم ان سے محبت کرتے ہیں، قسم ہے اللہ کی کہ ہم انہیں بڑا مانتے ہیں، اور ہمارے دلوں میں ان کے لیے عظیم احترام اور تقدیر ہے۔لیکن یہ سارا احترام اور تقدیر ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم ان میں سے کسی کے قول کو رسول اللہ ﷺ کے قول پر مقدم کریں۔

ائمہ اربعہ ہمارے نزدیک بشر ہیں، وہ معصوم نہیں، ان سے خطا بھی ہو سکتی ہے، اگرچہ وہ زیادہ تر حق بات کہتے ہیں۔ چاہے ان کے اقوال باہم متفق ہوں تب بھی ان کا اتفاق حجت یا اجماع شمار نہیں ہوتا۔ یہی اصولیوں کے دو اقوال میں سے صحیح قول ہے۔ لہٰذا وہ بشر ہیں، ان کے اجتہادات ہیں، اور ان میں بعض اجتہادات ثابت ہیں جن میں انہوں نے نص کے خلاف بات کہی۔یہ ثابت ہے کہ ائمہ کے بعض اجتہادات دلائل کے خلاف ہیں۔ تو ایسی صورت میں ہم پر کیا واجب ہے؟ واجب یہ ہے کہ جب بھی ان چاروں ائمہ میں سے کسی ایک کا قول نبی ﷺ کے فرمان کے خلاف ظاہر ہو جائے، تو ہم اس کا قول رد کریں اور نبی ﷺ کے قول کو اختیار کریں۔ ہر ایک امام کی بات لی بھی جاتی ہے اور چھوڑ بھی دی

جاتی ہے، سوائے معصوم کے۔ اور یہ ایک قاعدہ ہے جو آگے تھوڑی دیر میں آئے گا ان شاء اللہ۔

پس اے بھائیو! ہمارے لیے ہرگز حلال نہیں کہ ہم ان ائمہ اربعہ میں سے کسی کے قول کو رسول اللہ ﷺ کے قول پر مقدم کریں۔ رسول اللہ ﷺ کا قول اصل ہے اور ائمہ اربعہ کے اقوال فرع ہیں۔ جب فرع اصل کے مخالف ہو جائے تو ہم فرع کو چھوڑ دیں گے اور اصل کو اختیار کریں گے۔

کیونکہ وہ معصوم نہیں اور رسول اللہ ﷺ کا قول معصوم ہے۔ پس واجب یہ ہے کہ ہم معصوم کے قول کو غیر معصوم پر مقدم کریں۔ اور ہم ان ائمہ میں سے کسی ایک کے قول کو اس لیے رد نہیں کرتے کہ ہمارے دلوں میں ان سے بغض ہے، یا اپنی سرزمین اور اپنے امام کے مذہب کی طرف عصبیت کی وجہ سے، یا ان کی بے ادبی کی وجہ سے۔ نہیں! بلکہ یہ ایک شرعی واجب ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ہم پر فرض کیا ہے۔ بلکہ خود انہی ائمہ نے بھی اس بات پر نص کی ہے، جیسا کہ میں نے ابھی آپ کے سامنے ان کے اقوال ذکر کیے تھے۔ انہوں نے اپنے پیروکاروں کو اجازت نہیں دی کہ وہ ان کے اقوال کو رسول اللہ ﷺ کے اقوال پر مقدم کریں۔ لہٰذا ہم امام مالک کے اس قول کو قبول نہیں کرتے جس میں انہوں نے ’’خیارِ مجلس‘‘ (یعنی بیع کے وقت دونوں کو مجلس میں رہتے ہوئے بیع فسخ کرنے کا اختیار) کو رد کیا ہے۔ ہم ان کا قول قبول نہیں کرتے بلکہ حق ’’خیارِ مجلس‘‘ ہے، کیونکہ اس پر حدیث صحیح ثابت ہے۔

بخاری و مسلم کی حدیث حکیم بن حزام میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جب دو آدمی خرید و فروخت کریں تو ہر ایک کو اس وقت تک اختیار ہے جب تک وہ دونوں جدا نہ ہو جائیں۔ پس ہم امام مالکؒ کا وہ قول نہیں لیتے جس میں انہوں نے ’’خیارِ مجلس‘‘ کا انکار کیا، کیوں؟ اس لیے کہ وہ اس صحیح دلیل کے مخالف ہے۔

اسی طرح ہم امام ابو حنیفہؒ کا یہ قول بھی قبول نہیں کرتے کہ نماز میں ’’طمأنینۃ‘‘ (اطمینان) واجب نہیں۔ یہ حنفیہ کا مذہب ہے کہ طمأنیہ نہ رکن ہے اور نہ واجب۔ کیا ہم یہ قول قبول کرتے ہیں؟ جواب: نہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ یہ دلیل کے خلاف ہے۔

جیسا کہ بخاری و مسلم کی حدیث ابو ہریرہ میں ہے: جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو اچھی طرح وضو کرو، پھر قبلہ رخ کھڑے ہو کر تکبیر کہو، پھر جو قرآن میسر ہو وہ پڑھو، پھر رکوع کرو حتی کہ اطمینان سے رکوع میں جاؤ، پھر سیدھے

کھڑے ہو جاؤ حتی کہ مکمل سیدھے کھڑے ہو جاؤ، پھر سجدہ کرو حتی کہ اطمینان سے سجدہ کرو... (یہ پوری حدیث آپ سب کو معلوم ہے)۔

یہ نص صحیح ہے طمأنینہ کے وجوب پر۔

پس ہم امام ابو حنیفہؒ کی بڑی تعظیم کرتے ہیں، وہ ائمہ میں سے ایک ہیں، ہمارے دل انہیں محبت اور عظمت سے یاد کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے رب کی تعظیم ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اس مسئلے میں ان کے قول کو رسول اللہ ﷺ کے قول پر مقدم کر دیں۔ بلکہ ہم ان کے لیے عذر بھی بیان کرتے ہیں۔ جیسے کہ انہوں نے عورت کو یہ اجازت دی کہ وہ بغیر ولی کے خود اپنا نکاح کر لے۔ ہم امام ابو حنیفہؒ کا یہ قول قبول نہیں کرتے۔ اگر کوئی پوچھے: کیوں؟ ہم کہتے ہیں: اس لیے کہ یہ صحیح احادیث کے خلاف ہے۔ سنن میں ابو بردہ بن ابو موسیٰ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی نکاح ولی کے بغیر نہیں۔''اور سنن ابی داود میں، جسے ابن حبان نے صحیح کہا ہے، عائشہؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''جو عورت ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرے اس کا نکاح باطل ہے۔''

اور کیا خوب کہا امام شافعیؒ نے! اللہ ان پر رحم کرے۔ فرمایا: ''کوئی بھی عالم ایسا نہیں جس سے کوئی سنت فوت نہ ہو گئی ہو یا وہ اس سے غافل نہ ہو گیا ہو۔''

یہ جملہ سونے کے پانی سے لکھنے کے قابل ہے۔ بلکہ آنکھوں کے پانی سے لکھنے کے لائق ہے۔ کیونکہ یہ علماء کے لیے عذر بیان کرتا ہے۔

ورنہ ممکن ہے کہ طلبہ کے دلوں میں یہ سوال آئے کہ: جب دلیل واضح تھی تو امام مالک نے کیوں چھوڑ دی؟ جب دلیل روشن تھی تو فلاں امام نے کیوں ترک کر دیا؟ اس کا جواب امام شافعیؒ نے دیا: ''کوئی بھی نہیں مگر یہ کہ اس سے کوئی سنت فوت ہو جاتی ہے یا وہ اس سے غافل ہو جاتا ہے۔''

اور اس سلسلے میں بہتر ہوگا کہ آپ لوگ اس کورس کے بعد ایک عظیم کتاب کا مطالعہ کریں، جو شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی ہے۔ میں ہمیشہ اس پر زور دیتا ہوں کہ ہمیں اختلاف سے پہلے ''ادبِ اختلاف'' سیکھنا چاہیے۔ کیا آپ مجھ سے یہ بات ہمیشہ نہیں سنتے؟ ''ادبِ اختلاف'' آپ کو ابن تیمیہ کی کتاب ''رفع الملام عن الأئمة الأعلام'' میں ملے گا۔ یہ کتاب ضرور پڑھیں۔ دیکھیں کس عظیم انداز سے علماء کے لیے عذر ذکر کیے ہیں اور کس شان سے ان کا احترام بیان کیا ہے۔ہم نے امام مالک کا ذکر کیا، امام شافعی کا ذکر کیا، اور اب ہم امام ابو حنیفہ کا ذکر کر رہے

ہیں۔اسی طرح ہم امام شافعیؒ کا یہ قول بھی قبول نہیں کرتے کہ بلا عذر صف کے پیچھے تنہا نماز پڑھنے والے کی نماز صحیح ہے۔ یہ شافعیہ کا مذہب ہے۔ لیکن ہم اس کو قبول نہیں کرتے۔ کیوں؟ اس لیے کہ یہ سنت کے خلاف ہے۔حدیث وابصة بن معبدؓ میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''صف کے پیچھے اکیلے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے کی کوئی نماز نہیں۔''اور حدیث علی بن شیبان میں بھی ہے: ''صف کے پیچھے اکیلے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے کی کوئی نماز نہیں۔''اور وابصة کی حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا جو صف کے پیچھے اکیلا نماز پڑھ رہا تھا، تو آپ ﷺ نے اسے حکم دیا کہ وہ نماز دوبارہ پڑھے۔

حدیث کی دلالت بالکل واضح ہے کہ جو شخص صف میں ملنے کی قدرت رکھتا ہو، اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ صف کے پیچھے اکیلا نماز پڑھے۔ ہاں اگر وہ بالکل عاجز ہو اور صف میں جگہ نہ ہو سکے تو عذر کی وجہ سے اس کی نماز جائز ہے۔ یہی رائے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی بھی ہے۔

اور اسی طرح ہم امام احمد رحمہ اللہ کا یہ قول بھی قبول نہیں کرتے کہ ایک روایت میں آیا ہے کہ دباغت (چمڑا دباغنے) سے پاکیزگی حاصل نہیں ہوتی۔ یہ روایت ان کے مذہب میں ان سے منقول ہے کہ دباغت مردار کے چمڑے کو پاک نہیں کرتی۔ حالانکہ اگر آپ ان دلائل کو دیکھیں جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ دباغت مردار کے چمڑے کو پاک کر دیتی ہے تو وہ اتنے زیادہ ہیں کہ شمار میں نہیں آ سکتے۔ میں ان میں سے صرف تین احادیث آپ کے سامنے ذکر کرتا ہوں۔

صحیح بخاری میں سیدہ سودہ بنت زمعة زوجۂ نبی ﷺ سے مروی ہے، وہ کہتی ہیں کہ ہمارے پاس ایک بکری مر گئی تو ہم نے اس کی کھال دباغ لی اور پھر ہم اس میں (پانی وغیرہ) ڈال کر استعمال کرتے رہے یہاں تک کہ...

اور سنن ابی داؤد میں صحیح سند کے ساتھ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ دباغنے کے بعد مردار کی کھالوں سے فائدہ اٹھائیں۔ اور صحیح مسلم میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''جب کھال کو دباغ دیا جائے تو وہ پاک ہو جاتی ہے۔''

اور بخاری و مسلم دونوں میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو مولاۃ میمونہ رضی اللہ عنہا کو ایک بکری صدقے میں دی گئی جو مر گئی۔ آپ ﷺ اس کے پاس سے گزرے جبکہ وہ اسے گھسیٹ رہے تھے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم نے اس کی کھال کیوں نہیں لی اور اسے دباغ کر کے اس سے فائدہ

کیوں نہیں اٹھایا؟'' انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ تو مردار ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اسے پانی اور قرظ (یعنی ایک پودے کی چھال جس سے دباغ دیا جاتا ہے) پاک کر دیتے ہیں۔''اور سنن ابی داؤد میں صحیح سند کے ساتھ سلمہ بن المحبق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''مردار کی کھالوں کو دباغ دینا ہی ان کو پاک کرنا ہے۔''اور نسائی و ابی داؤد میں میمونہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے کہ نبی ﷺ ایک قوم کے پاس سے گزرے جو ایک مردہ بکری کو اس طرح گھسیٹ رہے تھے جیسے گدھے کو گھسیٹا جاتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم نے اس کی کھال کیوں نہیں لی؟'' انہوں نے کہا: یہ تو مردار ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اسے پانی اور قرظ پاک کر دیتے ہیں۔''اور اس بارے میں دلائل بہت زیادہ ہیں۔ تو ایسی کثرتِ دلائل کے ہوتے ۔۔ہوئے ہمارے لیے جائز نہیں کہ ہم ان سب کو چھوڑ کر امام احمد رحمہ اللہ کا قول اختیار کریں۔

اے طالب علم! اسی طرح مسلسل آگے بڑھو۔ علماء کے اقوال کو اسی طریقے پر قبول کرو: پہلے عالم کا قول سنو، پھر ہرگز اس کے قول کو صرف اس وجہ سے نہ مان لو کہ وہ اس سے صادر ہوا ہے، بلکہ دیکھو کہ اس کا ماخذ کیا ہے۔ اگر تمہیں اس کا ماخذ صحیح اور واضح ملے تو پھر اس کو قبول کرو، لیکن اس وجہ سے نہیں کہ یہ فلاں کا قول ہے، بلکہ اس وجہ سے کہ اس کا قول شریعت کے قول کے موافق ہے۔ لیکن اگر تم دیکھو کہ اس کا ماخذ دلیل کے اعتبار سے اس کی مدد نہیں کرتا، تو تم پر حق لازم ہے کہ اس کو رد کرو، مگر پورے ادب و احترام کے ساتھ۔ یہی دینِ الٰہی کا مطلب ہے۔

اور میں نے آپ کو اپنی رسالہ میں اس کی بے شمار مثالیں دی ہیں۔ اور فروعی مسائل میں سے ایک فرع (یعنی مثال) یہ بھی ہے جو کہ حقیقت میں ایک قاعدہ کی طرف اشارہ ہے جو بعد میں آئے گا۔ ابن القیم رحمہ اللہ ،اللہ کے فرمان ''اپنی آوازوں کو نبی ﷺ کی آواز سے بلند نہ کرو'' کی تفسیر میں کہتے ہیں: ''جب اپنی آواز کو نبی ﷺ کی آواز سے بلند کرنا ان کے اعمال کے برباد ہونے کا سبب بن گیا، تو پھر اپنے آراء، عقلوں، ذوقوں، سیاستوں اور علم کو اس کے اوپر مقدم کرنے کا کیا حال ہوگا؟ کیا یہ بدرجہ اولیٰ ان کے اعمال کو برباد کرنے والا نہیں ہوگا؟'' جواب: کیوں نہیں، بدرجہ اولیٰ۔

اسی لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نصوصِ وحی کو اپنی رائے کے مقابلے میں پیش نہیں کرتے تھے۔ بلکہ نصوص ان کے دلوں میں اس قدر عظیم اور ان کی نگاہوں میں اس قدر بلند تھیں کہ وہ ان کے مقابلے میں کسی کا قول نہیں رکھتے

تھے۔ ہاں، کبھی وہ کسی نص کے بارے میں اشکال کرتے اور اس اشکال کو رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کرتے تو آپ ﷺ ان کو جواب دیتے۔ کبھی وہ آپ ﷺ سے ان نصوص کے بارے میں پوچھتے جن کا بظاہر آپس میں تعارض معلوم ہوتا، لیکن ان میں سے کسی نے بھی کبھی ایسا نہیں کیا کہ کسی عقلی دلیل کو پیش کر کے نص کا انکار کرے۔ اور یہ سب سے زیادہ کامل عقلوں والے لوگ تھے۔(ابن القیم کا کلام ختم کلام۔)

اسی قاعدہ کی ایک اور خوبصورت مثال سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا قول ہے جس کو ابوداؤد نے اپنی سنن میں حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے: ''اگر دین رائے پر مبنی ہوتا تو خف کے نچلے حصے پر مسح کرنا اس کے اوپر کے حصے پر مسح کرنے سے زیادہ اولیٰ ہوتا۔ حالانکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ اپنے خف کے اوپر کے حصے پر مسح کرتے تھے۔''

اللہ تم پر رحم کرے! اس عظیم فقہ کو دیکھو۔ یہی وہ فقہ ہے جس پر ہم اس درس میں اپنی تربیت کرنا چاہتے ہیں۔ علی رضی اللہ عنہ نے اس فقہ کو ایک ہی حدیث میں ہمارے لیے مختصر کر دیا۔ اللہ کی قسم! یہی فقہ زمین پر سب سے عظیم فقہ ہے۔،زمین پر سب سے عظیم فقہ یہ ہے کہ تم اپنی رائے کو چھوڑ دو جب تمہیں دلیل اس کے خلاف نظر آ جائے۔ زمین پر سب سے عظیم فقہ یہ ہے کہ تم اپنے نفس کو الزام دو تاکہ دلیل اپنی جگہ باقی رہے۔ زمین پر سب سے عظیم فقہ یہ ہے کہ تم اپنے عقل، اپنی سوچ اور اپنے اجتہاد کو شک میں ڈال دو کیونکہ تم نے دیکھا کہ دلیل مقدم رکھنے کے زیادہ لائق ہے۔ ورنہ اگر تم خف کو دیکھو تو جو حصہ زمین سے مس ہوتا ہے وہ زیادہ لائق ہے کہ اس پر مسح کیا جائے بہ نسبت اس کے جو زمین سے نہیں لگتا۔ یہ رائے اور عقل ہے۔ لیکن علی رضی اللہ عنہ نے اپنی رائے کو توڑ ڈالا، اپنی عقل کو توڑ ڈالا اور اپنے اعتماد کو رد کیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے اپنے خف کے اوپر کے حصے پر مسح کیا۔ جب حدیث آ جائے تو بس۔ رائیں ختم، عقلیں خاموش۔ کبھی بھی صحیح نص کے مقابلے میں نہ رائے معتبر ہے، نہ کوئی قول، نہ اجتہاد، نہ عقل، اگر وہ نص کے مخالف ہو۔

اے بھائیو! سیدھے راستے پر جمے رہو۔ یہی سیدھا راستہ ہے۔ اللہ کی قسم! میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ یہی جنت کی راہ ہے۔ اگر تم سچے عالم، پختہ بنیادوں والے، اور امت کے نفع کے لیے بننا چاہتے ہو تو یہی طریقہ ہے۔

اور اسی طرح ایک اور قاعدہ ہے جو آگے بھی آئے گا۔ جان لو اللہ تم پر رحم کرے کہ صحیح حدیث پر عمل کرنا واجب ہے، چاہے اس کی مخالفت کرنے والے اہلِ علم میں سے کوئی بھی کیوں نہ ہو۔اسی وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ صحیح حدیث پر عمل کرنا لازم ہے، اگرچہ اس کے خلاف اہلِ مدینہ کا عمل ہو۔

خبردار! کسی حدیث کو صرف اس لیے نہ چھوڑنا کہ اہلِ مدینہ نے اس پر عمل نہیں کیا۔ اور خبردار! مالکیہ کے اس اصول کو نہ اپنانا کہ ہر وہ حدیث جو اہلِ مدینہ کے عمل کے خلاف ہو تو اہلِ مدینہ کا عمل اس پر مقدم ہے۔ نہیں! یہ بات ناقابلِ قبول ہے، ناقابلِ قبول ہے۔

عیب دلیل میں نہیں ہوتا، اور عذر تلاش کرنے کا تعلق دلیل کے لیے نہیں بلکہ اہلِ مدینہ کے لیے ہے۔ تعریف اسی میں ہے کہ حدیث کی موافقت کی جائے نہ کہ مخالفت کی۔ عالم کے قول کی خوبصورتی اسی وقت ہوتی ہے جب وہ نصوص کے موافق ہو۔ حق وہی ہے جو سنت کے مطابق ہو۔ اگر اہلِ مدینہ نے کسی حدیث کے خلاف عمل کیا تو وہ ان کا عمل ہے، لیکن حدیث ہمارے لیے ہے۔ ان کا اجتہاد ان کے لیے تھا، ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ اللہ ان کو معاف کرے اور درگزر فرمائے۔ لیکن صحیح سنت کو ہم اہلِ مدینہ کی خاطر نہیں چھوڑیں گے، چاہے وہ اس کے مخالف ہی کیوں نہ ہوں۔ اسی لیے آپ دیکھتے ہیں کہ ائمہ مالکیہ کے مذہب میں بہت سے فروع ایسے ہیں جن میں صحیح احادیث موجود ہیں، لیکن آپ پاتے ہیں کہ مالکیہ ان کو قبول نہیں کرتے اور اس کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ "ہمارے علاقے میں اس پر عمل نہیں ہے۔"

اسی وجہ سے مالکیہ کے بعض علماء نے حدیثِ "خِیارُ المَجلِس" (یعنی بیع کرنے والوں کے لیے مجلس میں رہتے ہوئے فسخ کرنے کا اختیار) کو رد کر دیا، کیونکہ اس پر اہلِ مدینہ نے عمل نہیں کیا۔اسی طرح انہوں نے جمعہ کے دن خطبہ کے دوران مسجد میں آنے والے کے لیے دو رکعت نماز پڑھنے کی احادیث کو بھی رد کیا، اس لیے کہ اہلِ مدینہ نے اس پر عمل نہیں کیا۔ اور انہوں نے بہت سی احادیث کو اسی علّت سے رد کیا۔ تو یہ رد کرنا بھی ان فروع میں سے ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے سامنے پیش نہ ہو۔ اور فروع میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی عالم کے قول کو معصوم نہ سمجھا جائے۔ خبردار! اہلِ علم میں سے کسی کے قول پر عصمت کا لبادہ نہ چڑھاؤ۔ محتاط رہو! یہ درست نہیں کہ ہم کسی ایک عالم کے قول کو ایسی حیثیت دے دیں کہ وہ دلیل بن جائے جس کی مخالفت نہ کی جا سکے۔

یا اس کو ایسا نص سمجھیں جو جھگڑوں کا فیصلہ کن ہو۔ یا یہ اعتقاد رکھیں کہ اس کا قول غلطی سے پاک ہے۔ یہ سب کچھ کسی بھی عالم کے کسی بھی قول کے بارے میں ماننا جائز نہیں۔

ہاں، ان کا اجماع حجت ہے اور معصوم ہے اور وہ ہمیشہ حق ہوتا ہے، لیکن یہاں بات اجماع کی نہیں ہو رہی بلکہ ان میں سے کسی ایک کے قول کی ہے۔ اور اہلِ علم کے نزدیک یہ طے شدہ بات ہے کہ علماء کے اقوال کے لیے دلیل پیش کی جاتی ہے، نہ کہ ان سے دلیل قائم کی جاتی ہے۔اس لیے علماء کے اقوال کو ذاتی طور پر لازماً قبول کر لینا درست نہیں۔ بلکہ ضروری ہے کہ ان کو کتاب و سنت کی ادلّہ پر پیش کیا جائے۔ جو اقوال کتاب و سنت کے موافق ہوں ہم ان کو قبول کرتے ہیں اور ان پر اعتماد کرتے ہیں، اور جو ان کے مخالف ہوں ان کو رد کرنا واجب ہے۔

یہ ذکر کرنا ضروری ہے، کیوں؟ اس لیے کہ بہت سے علماء یا طلبہ اپنے امام کے قول کو معصوم سمجھ لیتے ہیں۔ تو جب دلیل ان کے امام کے قول کے خلاف آتی ہے تو وہ اس مخالفت کو بہت بڑا سمجھتے ہیں اور امام کے بارے میں یہ ماننے کو تیار نہیں ہوتے کہ انہوں نے دلیل کے خلاف بات کہی ہو۔ پھر وہ دلیل کا رخ موڑتے ہیں یہاں تک کہ وہ امام کے قول کے مطابق ہو جائے۔ اور یہ سب کچھ جائز نہیں۔

کیا آپ لوگوں نے یہ قاعدہ سمجھ لیا؟

خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے لیے جائز نہیں کہ ہم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے سامنے کسی قول، کسی مذہب، کسی عقل، کسی اجتہاد یا کسی اور چیز کو مقدم کریں۔ شارع کا قول ہی مقدم ہے۔ اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

اب قاعدہ نمبر دو آ رہا ہے۔

قاعدہ نمبر دو: "لا ترفعوا..." کون مکمل کرے گا؟ یہ قاعدہ تعظیمِ دلیل کے اصولوں میں سے ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ------

"اپنی آوازیں نبی ﷺ کی آواز سے بلند نہ کرو۔"

اور اس قاعدے کی اصل بھی سورہ حجرات میں ہے جو ہمیں دلیل کی تعظیم سکھاتی ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا:اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی کی آواز سے بلند نہ کرو اور ان کے ساتھ ایسے بلند آواز سے بات نہ کرو جیسے تم آپس میں ایک

دوسرے کے ساتھ کرتے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔"

اے بھائیو! اس آیت کے نزول کا سبب یہ تھا کہ جب وفدِ تمیم نبی ﷺ کی خدمت میں آیا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رائے دی کہ ان پر قعقاع بن معبد کو امیر بنایا جائے، اور عمر نے رائے دی کہ ان پر اقرع بن حابس کو امیر بنایا جائے۔

تو ابوبکر نے عمر سے کہا: تمہاری خواہش یہی تھی کہ میری مخالفت کرو۔ عمر نے کہا: نہیں، میری نیت تمہاری مخالفت نہیں تھی۔ پھر دونوں کی آوازیں رسول اللہ ﷺ کے سامنے بلند ہو گئیں۔ تب یہ آیت نازل ہوئی: "اپنی آوازیں نبی کی آواز سے بلند نہ کرو۔" یہ واقعہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ذکر کیا ہے۔

اور ایک اور سبب بھی ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ ایک ہی آیت کے نزول کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں موسیٰ بن انس سے روایت کیا ہے کہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: نبی ﷺ نے ثابت بن قیس کو یاد فرمایا۔ پھر ایک شخص نے کہا: یا رسول اللہ! میں آپ کو ان کی خبر لاتا ہوں۔وہ ان کے پاس گیا اور انہیں اپنے گھر میں پریشان اور سر جھکائے پایا۔ اس سے پوچھا: اے ثابت! تمہیں کیا ہوا ہے؟انہوں نے کہا: برائی (یعنی ہلاکت) ہے، اللہ کی پناہ۔ میں اپنی آواز نبی ﷺ کی آواز پر بلند کرتا رہا۔ اور جو شخص اپنی آواز نبی ﷺ کی آواز پر بلند کرے تو اس کے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں اور وہ جہنم والوں میں سے ہو جاتا ہے۔پھر وہ شخص نبی ﷺ کے پاس آیا اور آپ کو ان کا حال بتایا۔ تو نبی ﷺ نے فرمایا: جاؤ ثابت کے پاس اور ان سے کہہ دو: تم جہنمی نہیں بلکہ جنتی ہو۔

تو ہر وہ شخص جو اپنی آواز نبی ﷺ کی آواز پر بلند کرے وہ اس خطرے میں ہے کہ اللہ اس کے اعمال برباد کر دے۔ اگر کوئی کہے: کیا یہ سب اعمال برباد ہوں گے یا کچھ اعمال؟ تو جواب یہ ہے کہ نص کے ظاہر کے مطابق سارے اعمال برباد ہوں گے۔ کیونکہ فرمایا گیا: "کہ تمہارے اعمال برباد ہو جائیں"۔ اور یہاں لفظ "اعمال" عام ہے، اس میں سب اعمال شامل ہیں۔اسی لیے ائمہ رحمہم اللہ نے اس پر تنبیہ کی ہے اور امت کو اس سے ڈرایا ہے کہ اپنی آواز کو نبی ﷺ کی آواز پر بلند نہ کریں۔

امام ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: امام احمد جب بھی کوئی نص پاتے تو اسی کے مطابق فتویٰ دیتے اور اس کے خلاف کسی کی بات کی طرف توجہ نہ کرتے،

چاہے وہ کوئی بھی ہو۔اور یہ بات تو ظاہر ہے کہ نبی ﷺ اب دنیا میں نہیں ہیں، تو اب ہم کیسے اپنی آواز کو آپ ﷺ کی آواز پر بلند کریں؟

جواب یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو سنت پر اپنی آواز بلند کرتا ہے تو گویا اس نے نبی ﷺ کی آواز پر اپنی آواز بلند کی۔یعنی اگر کہا جائے: رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا ہے، اور وہ شخص اس کے مقابلے میں اپنی بات بلند کرے یا حدیث کی مخالفت کرے تو وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہوں نے نبی ﷺ کی آواز پر اپنی آواز بلند کی۔

امام عبدالرحمن بن مہدی رحمہ اللہ جب حدیث پڑھتے تو مجلس والوں کو حکم دیتے کہ خاموش رہیں اور کہتے: اپنی آوازیں رسول اللہ ﷺ کی آواز سے بلند نہ کرو۔ وہ سمجھتے تھے کہ جب نبی ﷺ کی حدیث پڑھی جائے تو ویسا ہی سکوت اختیار کرنا چاہیے جیسا کہ قرآن سنتے وقت کیا جاتا ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے "الصارم المسلول" میں فرمایا: اللہ نے ڈرایا ہے کہ کہیں تمہارے اعمال ضائع نہ ہو جائیں، یا خوف دلایا ہے کہ تمہارے اعمال ضائع نہ ہو جائیں، یا روکا ہے کہ تمہارے اعمال ضائع نہ ہو جائیں۔

پس اللہ نے انہیں نبی ﷺ کی آواز پر اپنی آواز بلند کرنے اور ان سے ایسے بلند آواز سے بات کرنے سے منع کیا جیسے وہ آپس میں کرتے ہیں، کیونکہ یہ بلند کرنا اور شور کرنا عمل کے برباد ہونے کا سبب بن سکتا ہے اور انسان کو پتہ بھی نہ چلے۔

ابن القیم رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں: اگر اپنی آواز کو نبی ﷺ کی آواز پر بلند کرنا کفر یا اعمال کے ضائع ہونے کا خطرہ پیدا کرتا ہے، تو پھر عقلوں، رائے، ذوق، سیاست اور علوم کو آپ ﷺ کے لائے ہوئے دین پر مقدم کرنے کا کیا حال ہوگا؟ کیا یہ بدرجہ اولیٰ اعمال کے برباد ہونے کا سبب نہیں ہوگا؟ اور یہ بات ارتداد نہیں ہے بلکہ معصیت ہے جو عمل کو برباد کر دیتی ہے، اور صاحبِ عمل کو خبر بھی نہیں ہوتی۔

تو ذرا سوچو! جو شخص رسول اللہ ﷺ کے قول اور طریقے پر کسی اور کے قول اور طریقے کو مقدم کرے، کیا اس کے اعمال برباد نہیں ہو جائیں گے؟ جواب: کیوں نہیں۔

اسی لیے سلف میں سے بہت سے لوگوں نے کہا: "تم مت کہو جب تک رسول اللہ ﷺ نہ کہیں۔" وغیرہ۔

یہ سب باتیں اسی پر دلالت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں اپنی آوازیں بلند نہ کرو اور نہ ہی اونچی آواز سے بولو۔ یہ دونوں منع کرنے کے صیغے ہیں، اور مطلق نہی (منع) حرمت پر دلالت کرتی ہے۔ یہ قاعدے کی وضاحت نظری پہلو سے ہے۔ اب اس کی تفریعی پہلو سے شرح باقی ہے۔ کتنا وقت باقی ہے؟ آدھا گھنٹہ؟ اچھا تو ہم فروع پر بات مکمل کر لیتے ہیں۔

ان فروع میں سے پہلا فرع یہ ہے کہ علماء کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کی حدیث سننے کے وقت انسان کو بہترین حالت میں ہونا مستحب ہے۔ یعنی جب بھی انسان رسول اللہ ﷺ کی حدیث سنتا ہے یا مجلسِ حدیث میں بیٹھتا ہے تو وہ اپنی بہترین حالت میں ہو۔ حتیٰ کہ بہت سے ائمہ نے مستحب قرار دیا ہے کہ انسان بڑے اور چھوٹے دونوں حدث سے پاک ہو کر حدیث سنے۔ بعض ائمہ نے یہاں تک کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث سننا مناسب نہیں کہ انسان لیٹا ہوا یا ٹیک لگا کر ہو۔ یہ سب رسول اللہ ﷺ کی حدیث کی تعظیم کے باب میں ہے۔ اگرچہ راجح قول یہ ہے کہ قرآن مجید کو لیٹے ہوئے پڑھنا جائز ہے، جیسا کہ نبی ﷺ ہر حال میں اللہ کا ذکر کرتے تھے۔ لیکن یہاں مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ ائمہ نے رسول اللہ ﷺ کی حدیث کی تعظیم کو لازم قرار دیا۔

دوسرا فرع یہ ہے کہ اگر کوئی عقل، رائے، اجتہاد یا قیاس حدیث کے مقابل آئے تو واجب ہے کہ اسے رد کر دیا جائے۔ خبردار! کبھی اپنے امام کی آواز رسول اللہ ﷺ کی آواز پر بلند نہ کرو۔ اور نہ ہی اپنی عقل کی آواز رسول اللہ ﷺ کی آواز پر بلند کرو۔ اور نہ اپنی رائے کی آواز کو رسول اللہ ﷺ کی آواز پر اونچا کرو۔ اور نہ اپنے قیاس کی آواز کو رسول اللہ ﷺ کی آواز پر مقدم کرو۔ بہت زیادہ احتیاط کرو اور اس سے سختی کے ساتھ بچو۔

اور فروع میں سے ایک یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی مخالفت حرام ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اور جو شخص رسول کی مخالفت کرے اس کے بعد کہ ہدایت اس پر واضح ہو چکی ہو، اور مومنوں کے راستے کے علاوہ کسی اور راستے پر چلے تو ہم اسے اسی پر چھوڑ دیں گے جس کی طرف وہ گیا اور جہنم میں ڈالیں گے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔'' علماء نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کی آواز پر اپنی آواز بلند کرنا مخالفت کی ایک قسم ہے۔ اور یہ مخالفت حرام ہے اور اس کے کرنے والوں کے لیے سخت وعید آئی ہے۔

اور فروع میں سے ایک یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تعظیم اور توقیر واجب ہے، جو اس بات کو لازم کرتا ہے کہ حدیث سننے کے وقت آواز کو نیچا رکھا جائے۔ لہٰذا امت پر لازم ہے کہ وہ آپ ﷺ کی توقیر کرے، آپ کی تعظیم کرے اور آپ کا احترام کرے۔ اور یہ سب تقاضا کرتا ہے کہ ہم اپنی آوازیں آپ ﷺ کی آواز سے بلند نہ کریں۔ حتیٰ کہ علماء نے مکروہ قرار دیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث سننے کے وقت اشکالات (اعتراضات) پیش کیے جائیں، سوائے اس کے کہ کوئی ناگزیر ضرورت ہو۔

اور فروع میں سے ایک اور عجیب مگر عظیم فرع یہ ہے کہ بعض علماء نے آپ ﷺ کے قبرِ مبارک کے پاس آواز بلند کرنے کو مکروہ کہا ہے۔ یعنی قبر پر چیخ و پکار یا شور و شرابا مناسب نہیں۔ جیسے زندگی میں آپ ﷺ کے سامنے شور مچانا جائز نہیں تھا، اسی طرح قبر پر بھی جائز نہیں۔ کیونکہ آپ ﷺ اپنی قبر میں برزخی زندگی گزار رہے ہیں۔ اور قاعدہ یہ ہے کہ ''آپ ﷺ کی حرمت وفات کے بعد بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ زندگی میں تھی۔''

اسی طرح ایک اور فرع یہ ہے کہ آپ ﷺ کے مسجد میں آوازیں بلند کرنا مکروہ ہے، یعنی بلا فائدہ شور مچانا یا جھگڑنا۔ کیونکہ یہ مسجد آپ ﷺ کی حضوری کا مقام ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں مسجدِ رسول اللہ ﷺ میں سو رہا تھا تو ایک شخص نے مجھے کنکری ماری۔ میں نے دیکھا کہ وہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تھے۔ انہوں نے کہا: ان دونوں آدمیوں کو میرے پاس لاؤ۔ میں انہیں لے آیا۔ عمرؓ نے پوچھا: تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ انہوں نے کہا: ہم طائف کے رہنے والے ہیں۔ عمرؓ نے فرمایا: اگر تم اہلِ مدینہ میں سے ہوتے تو میں تمہیں ضرور سخت سزا دیتا کہ تم مسجدِ رسول اللہ ﷺ میں اپنی آوازیں بلند کرتے ہو۔ اپنی آوازیں نبی ﷺ کی آواز سے بلند نہ کرو۔'' تو جب صرف قبر اور مسجد میں آواز بلند کرنے پر یہ حکم ہے تو سوچو! اس شخص کا کیا حال ہوگا جو آپ ﷺ کی حدیث کو رد کرے؟ یا آپ کی شریعت کو چھوڑ کر مشرق و مغرب کے قوانین کو اختیار کرے؟ ''اپنی آوازیں نبی ﷺ کی آواز پر بلند نہ کرو۔''

اللہ اکبر! بعض سلف ایسے تھے جو مجلسِ حدیث میں جانے سے پہلے بہترین کپڑے پہنتے، عمدہ خوشبو لگاتے اور طہارت اختیار کرتے۔ خواہ وہ عالم ہوں یا طالب علم، یہ سب رسول اللہ ﷺ کی حدیث کی تعظیم کے لیے کرتے۔

اور فروع میں سے یہ بھی ہے کہ جو شخص احادیث کو رد کرنے والا ہو، یا ان کو اپنی خواہشات کے تابع کرنے والا ہو، تو امام المسلمین پر واجب ہے کہ اسے ایسی سزا دے جو اسے اور اس جیسے دوسروں کو روک دے کہ وہ اپنی آواز رسول اللہ ﷺ کی آواز پر بلند نہ کریں۔ یہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طرزِ عمل تھا۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک قریبی رشتہ دار کو کنکریاں مارتے دیکھا۔ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے کنکریاں مارنے سے منع فرمایا ہے۔ پھر انہوں نے دوبارہ اسے ایسا کرتے دیکھا۔ اس وقت انہوں نے تعزیر کی اور کہا: میں تمہیں رسول اللہ ﷺ کی حدیث سنا رہا ہوں اور تم پھر بھی کنکریاں مارتے ہو؟ اب میں تم سے کبھی بات نہیں کروں گا۔ اور وہ اپنی موت تک اس سے بات نہ کرتے۔یہ ضروری ہے کہ ایسے لوگوں کو سزا دی جائے، انہیں روکا جائے اور ان پر سختی کی جائے۔ اور آج کے دور میں ان کی کثرت ہو گئی ہے، اللہ ان کی تعداد نہ بڑھائے۔صحیحین میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کسی کی بیوی مسجد جانے کی اجازت مانگے تو وہ اسے منع نہ کرے۔

یہ قاعدے کی شرح تھی بطور اصولی وضاحت۔

اور اسی طرح ایک اور قاعدہ جو آگے بھی آئے گا، یہ ہے کہ اے طالب علم! جان لو اللہ تم پر رحم فرمائے کہ صحیح حدیث پر عمل کرنا واجب ہے، چاہے اس کے مخالف اہلِ علم میں سے کوئی بھی ہو۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ صحیح حدیث پر عمل واجب ہے، چاہے اہلِ مدینہ کے عمل کے خلاف ہو۔

تمہیں یہ حق نہیں کہ محض اس وجہ سے حدیث کو رد کر دو کہ اہلِ مدینہ نے اس پر عمل نہیں کیا۔ اور نہ ہی مالکیہ کے اس اصول پر عمل کرو کہ اگر کوئی حدیث اہلِ مدینہ کے عمل کے خلاف ہو تو اہلِ مدینہ کا عمل مقدم ہوگا۔ نہیں، یہ بات ناقابل قبول ہے۔

پھر ان کے بیٹے بلال نے کہا: "اللہ کی قسم! ہم تو انہیں ضرور روکیں گے۔"

تو ان کے والد عبداللہ اس پر سخت ناراض ہوئے اور اسے ایسی ڈانٹ پلائی کہ اس سے پہلے میں نے انہیں اتنے سخت الفاظ میں کسی کو ڈانٹتے ہوئے نہیں سنا تھا۔ یہ لعنت نہیں تھی بلکہ سخت ڈانٹ اور ڈپٹ تھی۔ یہ کس باب سے ہے؟ یہ تعزیر اور سختی کے باب سے ہے، یعنی جب کوئی سنت کے خلاف کرے تو اسے ڈانٹ کر روکا جائے۔

پھر وہ کہنے لگے: "میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے اور تم کہتے ہو کہ ہم تو ضرور روکیں گے؟"

لہٰذا ضروری ہے کہ مسلمانوں کا حاکم رسول اللہ ﷺ کی سنت کی تعظیم کرے اور ایسے گھٹیا لوگوں کو کھلا نہ چھوڑے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث کے ساتھ کھیلیں، اس کا مذاق اڑائیں اور اس کی توہین کریں اپنے میڈیا، اخبارات اور چینلز میں، بغیر کسی روک ٹوک اور تعزیر کے۔

اے حکمرانوں! ہوشیار رہو کہ رسول اللہ ﷺ کی ہیبت و عظمت لوگوں کے دلوں سے ختم نہ ہو جائے۔ اگر تم خاموش رہے اور یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "یہ تو آزادئ اظہار ہے"، تو اللہ تعالیٰ تمہاری ہیبت بھی تمہاری قوم کے دلوں سے نکال دے گا۔ پھر وہی قوم تمہیں حقیر جانے گی اور تمہارا مذاق اڑائے گی۔ لہٰذا ضروری ہے کہ روک تھام کی جائے اور سختی سے ڈانٹا جائے۔

اسی طرح صحیح حدیث میں عمران بن حصین سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "حیا سراسر بھلائی ہے، یا فرمایا کہ حیا ہمیشہ خیر ہی لاتا ہے۔"

پھر ایک شخص بشیر بن سعد نے کہا: "اے ابو نجید" (یہ عمران بن حصین کی کنیت تھی) "ہم تو بعض پرانی کتابوں یا حکمت کی باتوں میں پڑھتے ہیں کہ حیا کی کچھ قسم سکون و وقار دیتی ہے، لیکن کچھ حیا کمزوری کا باعث بھی بنتی ہے۔ تو پھر آپ کیسے کہتے ہیں کہ حیا سراسر بھلائی ہے؟"

یہ سن کر عمران بن حصین سخت ناراض ہوئے، حتیٰ کہ ان کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ اور کہا: "میں تمہیں رسول اللہ ﷺ کی حدیث سناتا ہوں اور تم اس کے مقابلے میں دلیل لاتے ہو؟" پھر انہوں نے دوبارہ حدیث بیان کی۔ لیکن بشیر نے پھر اپنی بات دہرائی۔ عمران بن حصین اور زیادہ غصے میں آگئے، یہاں تک کہ ہمیں انہیں ٹھنڈا کرنا پڑا اور کہنے لگے: "اے ابو نجید! برا نہ مانو، وہ برا آدمی نہیں، بس جلدی میں یہ بات کہہ بیٹھا ہے، ورنہ یہ اچھا اور نیک آدمی ہے، علم سے محبت کرتا ہے اور سنت کی تعظیم کرتا ہے۔" ہم مسلسل انہیں سمجھاتے رہے یہاں تک کہ وہ ٹھنڈے ہوگئے۔

ذرا دیکھو! عمران بن حصین سنت کے مقابل آنے والے پر کس قدر ناراض ہوئے۔ یہی رویہ ہونا چاہیے کہ جو سنت کا انکار کرے یا اس کے مقابل میں بات کرے، اس کے ساتھ سختی کی جائے تاکہ رسول اللہ ﷺ کی سنت کا ادب قائم رہے۔

پس اے طالب علم! جب تم رسول اللہ ﷺ کی حدیث سنو تو سر جھکا دو، اس پر ایمان لاؤ اور اس کے مفہوم کو قبول کرو۔ بہانے نہ تلاش کرو، اعتراضات نہ اٹھاؤ اور یہ نہ کہو کہ "اگر یہ ایسا ہے تو پھر یوں کیسے ہوگا؟" یا "یہ حدیث صحیح ہو تو پھر فلاں بات کیسے ممکن ہے؟" یا "کیا یہ رسول اللہ ﷺ کہہ سکتے ہیں؟" یہ سب اعتراضات وہی ہیں جو آج بعض میڈیا والے کرتے ہیں اور کچھ لوگ جو علماء کا بھیس بنا کر آتے ہیں۔

سنو، آثار میں آیا ہے کہ امام وکیع نے فرمایا: "قربانی کے جانور کو نشان لگانا اور اس پر قلادہ ڈالنا سنت ہے۔" یعنی جانور کے کوہان پر چاقو سے کٹ لگا دینا تاکہ خون نکل آئے، اور پھر سب جان لیں کہ یہ اللہ کے نام پر قربانی کے لیے وقف ہے۔ اس کے بعد کوئی چور یا ڈاکو اس پر ہاتھ نہیں ڈالے گا۔ یہاں تک کہ ان کے چور بھی مؤدب تھے، کہتے: "یہ اللہ کے لیے ہے، ہم تو صرف لوگوں کا مال چوری کرتے ہیں۔"

پھر ایک صاحب جو اہلِ رائے میں سے تھے کہنے لگے: "یہ تو جانور کو زخمی کرنا ہے، یہ تو محض ایک مثل ہے۔" یہ سن کر وکیع غضبناک ہوئے اور کہا: "میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے خود قربانی کے جانور کو نشان لگایا اور یہ سنت ہے، اور تم کہتے ہو کہ یہ محض مثال ہے؟ تم اس لائق ہو کہ قید کر دیے جاؤ اور اس وقت تک نہ چھوڑے جاؤ جب تک اس بات سے رجوع نہ کرو۔"

اگرچہ اس زمانے میں کوئی ایسا حاکم نہ تھا جو قید کرتا، لیکن وکیع کا مقصد یہ تھا کہ ایسے شخص کو سزا دی جانی چاہیے تاکہ وہ اپنی بات واپس لے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب بھی کوئی نص تمہارے پاس پہنچے تو اسے تھام لو، اس پر جم جاؤ اور اس سے روگردانی نہ کرو۔ اس پر دانتوں سے مضبوطی سے پکڑ لو، اور خبردار کہ اس کے خلاف نہ جاؤ، یا اس پر کسی اور بات کو مقدم نہ کرو۔

یاد رکھو، ہر عالم کی آواز، ہر فرقے کی بات، ہر مذہب کا قول سب دب جاتے ہیں جب رسول اللہ ﷺ کی حدیث سامنے آجائے۔ یہی تقویٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "جو لوگ رسول اللہ کے سامنے اپنی آوازیں پست رکھتے ہیں، انہی کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے پرکھ لیا ہے، ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر ہے۔"

بلکہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ گناہوں کے کفاروں میں سے ایک یہ ہے کہ جب حدیث پڑھی جائے تو زبان کو جھکا دیا جائے، یعنی اپنی زبان کو خاموش کر کے عاجزی اختیار کی جائے۔

عیب دلیل میں نہیں ہے، اور نہ ہی ہم دلیل کے لیے عذر تلاش کرتے ہیں، بلکہ ہم اہلِ مدینہ کے لیے عذر تلاش کرتے ہیں۔ اصل خوبی تو اس بات میں ہے کہ حدیث کے مطابق بات کی جائے، نہ کہ اس کے خلاف۔ عالم کے قول کی خوبصورتی اسی وقت ہے جب وہ نصوص کے موافق ہو۔ پس حق وہی ہے جو سنت کے مطابق ہو۔ اگر اہلِ مدینہ کا عمل حدیث کے خلاف ہے تو وہ عمل انہی کے لیے ہے، لیکن حدیث ہمارے لیے ہے۔ ان کا اجتہاد ان کا معاملہ ہے، ہم اس کے مکلف نہیں۔ اللہ ان کو معاف کرے اور ان سے درگزر فرمائے۔ لیکن صحیح سنت کو ہم اہلِ مدینہ کے لیے نہیں چھوڑیں گے چاہے انہوں نے مخالفت کی ہو۔ اسی لیے آپ دیکھتے ہیں کہ مالکیہ کے فقہ میں کئی ایسی شاخیں ہیں جہاں احادیث صحیحہ ثابت ہیں، لیکن وہ انہیں قبول نہیں کرتے اور یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ ہمارے ہاں ان پر عمل نہیں ہوا۔ اسی وجہ سے بعض مالکیہ نے "خِیارِ مجلس" والی حدیث کو رد کر دیا کیونکہ اہلِ مدینہ میں اس پر عمل نہیں ہوا۔ اور بعض نے جمعے کے دن خطبے کے دوران آنے والے شخص کے لیے دو رکعت نماز پڑھنے والی حدیث کو رد کر دیا کیونکہ اہلِ مدینہ میں اس پر عمل نہیں ہوا۔ اور بھی بہت سی احادیث کو اسی وجہ سے رد کیا گیا۔

لہٰذا یہ عذر بھی دراصل اسی اصول کی ایک شاخ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے آگے کسی چیز کو نہ رکھا جائے۔

اور ایک اور شاخ یہ ہے کہ ہمیں کسی بھی عالم کے قول کو معصوم نہ سمجھنا چاہیے۔ خبردار! کسی عالم کے قول پر عصمت کا لبادہ مت چڑھاؤ۔ یہ درست نہیں کہ کسی ایک عالم کے قول کو ایسا درجہ دے دیا جائے کہ اسے دلیل سمجھا جائے جس کے خلاف کچھ نہ کہا جا سکے۔ یا یہ اعتقاد رکھا جائے کہ اس کا قول خطا سے پاک ہے۔ یہ سب باتیں درست نہیں۔

ہاں! اگر سب علماء کا اجماع ہو تو وہ معصوم اور حق ہوتا ہے، لیکن یہاں بحث اجماع کی نہیں، بلکہ کسی ایک عالم کے قول کی ہے۔ اور علماء کے ہاں یہ بات طے شدہ ہے کہ علماء کے اقوال کے لیے دلیل پیش کی جاتی ہے، ان اقوال کو خود دلیل نہیں مانا جاتا۔

پس کسی عالم کے قول کو ذاتی طور پر لازمی قبولیت نہیں دی جا سکتی۔ بلکہ ضروری ہے کہ ان اقوال کو کتاب و سنت پر پرکھا جائے۔ جو قول کتاب و سنت کے موافق ہو، ہم اسے قبول کرتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ اور جو ان کے خلاف ہو، اسے رد کرنا واجب ہے۔

یہ بات ذکر کرنا اس لیے ضروری ہے کہ آج کل بہت سے لوگ یا طلبۂ علم اپنے امام کے قول کو معصوم سمجھ لیتے ہیں۔ جب کوئی صحیح دلیل ان کے امام کے قول کے خلاف آتی ہے تو وہ اسے بڑا عجیب سمجھتے ہیں، اور امام سے اس مخالفت کو بعید جانتے ہیں۔ چنانچہ وہ حدیث کا مطلب گھما پھرا کر اس طرح کرنے لگتے ہیں کہ وہ امام کے قول کے موافق ہو جائے۔ اور یہ سب کچھ جائز نہیں۔

کیا آپ لوگوں نے یہ قاعدہ سمجھ لیا؟ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ: ہمیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے آگے نہ کوئی قول پیش کرنا چاہیے، نہ کوئی مذہب، نہ عقل، نہ اجتہاد اور نہ ہی کچھ اور۔ شارع کا قول ہی مقدم ہے۔

اللہ ہی زیادہ جانتا ہے۔

قاعدہ نمبر دو یہ ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ

... یہ بھی تعظیمِ دلیل کے قواعد میں سے ہے:

“ اپنی آوازیں نبی ﷺ کی آواز سے بلند نہ کرو۔”

اس قاعدے کی اصل بھی سورۂ حجرات میں ہے، جو ہمیں تعظیمِ دلیل سکھاتی ہے۔ اللہ نے فرمایا: اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی ﷺ کی آواز سے بلند نہ کرو، اور نہ ان کے ساتھ اس طرح زور سے بات کرو جیسے تم آپس میں کرتے ہو، ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

اس آیت کے نزول کا پس منظر یہ ہے کہ جب بنی تمیم کا وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا تو سیدنا ابوبکرؓ نے رائے دی کہ ان پر قعقاع بن معبد کو امیر بنایا جائے۔ سیدنا عمرؓ نے کہا: ان پر اقرع بن حابس کو امیر بناؤ۔ سیدنا ابوبکرؓ نے کہا: عمر! تمہاری غرض میری مخالفت ہے۔ سیدنا عمرؓ نے کہا: میں مخالفت کی نیت نہیں رکھتا۔ پھر ان دونوں کی آوازیں رسول اللہ ﷺ کے سامنے بلند ہو گئیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: اپنی آوازیں نبی کی آواز سے بلند نہ کرو۔

یہ سبب امام بخاری نے اپنی صحیح میں ذکر کیا ہے۔ ایک دوسرا سبب بھی ہے، اور تم جانتے ہو کہ بعض اوقات ایک آیت کے نزول کے کئی اسباب ہوتے ہیں، لہٰذا دونوں ہی اس کے اسباب ہیں۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ نبی ﷺ نے سیدنا ثابت بن قیس کو غائب پایا۔ ایک آدمی نے کہا: یا رسول اللہ! میں آپ کے لیے اس کا حال معلوم کرتا ہوں۔ وہ گیا تو دیکھا کہ

ثابت بن قیس گھر میں سر جھکائے افسردہ بیٹھے ہیں۔ پوچھا: کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا: برا حال ہے! میں اپنی آواز نبی ﷺ کی آواز سے بلند کرتا رہا ہوں۔ اور جو اپنی آواز نبی ﷺ کی آواز سے بلند کرے، اس کے اعمال ضائع ہو جائیں گے، وہ دوزخی ہے۔

پھر وہ آدمی نبی ﷺ کے پاس گیا اور ان کی بات بتائی۔ تو نبی ﷺ نے فرمایا: جاؤ، ثابت کو بتا دو کہ وہ دوزخی نہیں ہے بلکہ جنتی ہے۔

لہٰذا جس نے نبی ﷺ کی آواز پر اپنی آواز بلند کی، اس کے اعمال ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔ سوال یہ ہے: کیا سارے اعمال یا کچھ اعمال؟ بظاہر نص سے یہ لگتا ہے کہ سارے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں، کیونکہ فرمایا: "تمہارے اعمال ضائع نہ ہو جائیں"۔ یہ عام ہے۔ اسی لیے علما نے اس پر تنبیہ کی ہے۔

امام ابن القیم رحمہ اللہ کہتے ہیں: امام احمد جب کوئی حدیث پاتے تو اسی کے مطابق فتویٰ دیتے اور کسی کے خلاف قول کی طرف نہ دیکھتے

اب سوال ہے: نبی ﷺ تو اب فوت ہو گئے ہیں، تو اب ان کی آواز پر آواز بلند کرنا کیسے ہو سکتا ہے؟ جواب یہ ہے: جو کوئی سنت پر اپنی آواز بلند کرے، اس نے دراصل نبی ﷺ پر اپنی آواز بلند کی۔ جب کہا جائے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا ہے، اور کوئی شخص اپنی رائے اونچی کر کے اس کو رد کرے، تو وہی ہے جس نے اپنی آواز نبی ﷺ کی آواز پر بلند کی۔

اسی لیے امام عبدالرحمن بن مہدی جب حدیث پڑھتے تو سب کو خاموش ہونے کا حکم دیتے اور کہتے: اپنی آوازیں رسول اللہ ﷺ کی آواز پر بلند نہ کرو۔ وہ سمجھتے تھے کہ حدیث پڑھتے وقت سکوت واجب ہے، جیسے قرآن پڑھتے وقت سکوت واجب ہے۔

ابن تیمیہ نے فرمایا: اللہ نے اس ڈر سے منع کیا ہے کہ تمہارے اعمال ضائع نہ ہو جائیں، یا اس اندیشے سے کہ ضائع نہ ہو جائیں، یا بطورِ روک کہ ضائع نہ ہو جائیں۔ اس لیے اللہ نے ان کو نبی ﷺ کی آواز پر اپنی آواز بلند کرنے اور ان سے ایسے بات کرنے سے منع فرمایا جیسے ایک دوسرے سے کرتے ہو، کیونکہ یہ عمل انسان کے اعمال کے ضائع ہونے کا سبب بن سکتا ہے اور اس کو خبر بھی نہ ہو۔

ابن القیم کہتے ہیں: اگر صرف آواز بلند کرنے سے اعمال کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے جبکہ حدیث اپنی جگہ موجود ہے، تو سوچو کہ جو اپنی رائے کو حدیث پر مقدم کر دے اور نص کو ہی رد کر دے، وہ زیادہ بڑے خطرے میں ہے۔ کیا یہ زیادہ سزاوار نہیں کہ اس کے اعمال ضائع ہو جائیں؟ جواب ہے: جی ہاں

یہ بھی کہا کہ یہ عمل کفر نہیں بلکہ ایسی نافرمانی ہے جس سے اعمال برباد ہو سکتے ہیں اور انسان کو پتا بھی نہیں چلتا۔ تو سوچو جو رسول اللہ ﷺ کی سنت کو چھوڑ کر دوسروں کے اقوال اور طریقے کو مقدم کر لے، کیا اس کا عمل برباد ہونے کا زیادہ اندیشہ نہیں؟ جواب ہے: جی ہاں۔

لہٰذا اللہ نے نہی کی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے آگے نہ بڑھو۔ اور کیا کوئی آگے بڑھنے کی شکل اس سے زیادہ بڑی ہے کہ اپنی عقل کو رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے دین پر مقدم کیا جائے؟ اسی لیے سلف نے کہا ہے: "نہ کہو جب تک وہ نہ کہیں۔"

یہ سب اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان افعال کی سختی سے ممانعت ہے: نہ آواز بلند کرو اور نہ ہی جہر کرو۔ یہ دونوں ممانعتیں ہیں اور ممانعت بذاتِ خود حرمت پر دلالت کرتی ہے۔ یہ اس قاعدے کی وضاحت ہے نظری اعتبار سے۔

یعنی جب حدیث سنی جائے تو آدمی خاموش ہو جائے اور سکوت اختیار کرے۔ ممکن ہے کہ تم بڑے بڑے گناہوں کے مرتکب ہو لیکن حدیث کا ادب و احترام کرنے کی وجہ سے اللہ تمہارے ان بڑے گناہوں کو معاف فرما دے۔ ایسے لوگوں کے لیے مغفرت بھی ہے اور عظیم اجر بھی۔

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اور ہمارے بھائیوں کو نصوصِ شریعت اور دلائل کا ادب و احترام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ کیونکہ جو شخص اپنے دل میں ان کی تعظیم کرتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی اس کے مقام کو بلند کرتا ہے، اس کے ذکر کو اونچا کرتا ہے، اور اس کے اقوال کو قبولیت عطا فرماتا ہے۔ اسی طرح اس کے وہ اختیارات جو اس تعظیم کی بنیاد پر ہوتے ہیں، انہیں عزت و دوام اور آنے والے لوگوں میں اچھا ذکر عطا کرتا ہے۔

یہ سب اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں داخل ہے: وَاجْعَلْ لِي لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِينَ ﴾

سورۃ الشعراء، آیت 84 "اور میرے لیے بعد والوں میں سچائی کی زبان مقرر فرما۔"

پس جب تم دلائل کو عظمت دیتے ہو تو اللہ تمہارے لیے بعد والوں میں اچھا ذکر اور سچائی کی زبان مقرر فرما دیتا ہے۔

اللہ سب سے بلند ہے اور سب کچھ جاننے والا ہے، اور اللہ کی رحمتیں اور سلامتی نازل ہوں ہمارے نبی محمد ﷺ پر۔

دوسرا قاعدہ

تمام تعریف اللہ رب العالمین کے لیے ہے اور درود و سلام رسول اللہ، سچے امین ﷺ پر اور آپ کے اہلِ بیت، صحابہ کرام اور ان تمام لوگوں پر جو قیامت تک ان کے نقشِ قدم پر احسان کے ساتھ چلتے رہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ صرف قواعد کے بارے میں اطمینان کر لوں۔ ہم نے دو آسان اور سہل قواعد لیے تھے، کون انہیں بیان کرے گا؟ جی ہاں، اے شیخ فہد۔

پہلا قاعدہ: ''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کے آگے نہ بڑھو۔'' بہت خوب۔

دوسرا قاعدہ: ''اے ایمان والو! اپنی آوازیں نہ بلند کرو۔'' یہ دونوں واضح اور روشن ہیں، الحمد للہ۔ ہم نے ان کے دلائل ذکر کیے، اہلِ علم کی باتیں بیان کیں اور ان کے کچھ فروع بھی ذکر کیے۔ اللہ ہمیں اور آپ کو ان لوگوں میں شامل کرے جو نص (اللہ اور رسول ﷺ کے کلام) کی حقیقی تعظیم کرتے ہیں۔

تیسرا قاعدہ تعظیمِ نص کے اصولوں میں یہ ہے: شریعت دینے والے (اللہ اور اس کے رسول ﷺ) کے لیے اطاعت مطلق ہے، اور دوسروں کے لیے اطاعت صرف اس وقت ہے جب وہ شریعت دینے والے کی اطاعت میں ہوں

میں دوبارہ دہراتا ہوں: اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے اطاعت مطلق ہے، اور دوسروں کے لیے اطاعت صرف اس وقت ہے جب وہ شریعت دینے والے کی اطاعت میں ہوں۔کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی انسان کو یہ مقام دے کہ اس کی اطاعت مطلق ہوگی۔ کیونکہ مطلق اطاعت تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی خصوصیت ہے۔ اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جس کی اطاعت مطلق ہے، اور اس کے نبی ﷺ وہ ہستی ہیں جن کی اطاعت مطلق ہے۔کیونکہ نص (قرآن و سنت) نے ہمیں ان کی مطلق اطاعت کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''جس نے رسول کی

اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔‘‘ پس جس چیز میں بھی تم نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی تو درحقیقت تم نے اللہ کی اطاعت کی۔

اس قاعدے کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ’’اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی، اور اطاعت کرو رسول کی، اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہیں۔‘‘ اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کا حکم دیا، اور رسول کی اطاعت میں فعلِ طاعت کو دوبارہ ذکر کیا: ’’اور اطاعت کرو رسول کی‘‘۔ لیکن جب اولی الامر (امیر و حکمران) کا ذکر کیا تو وہاں یہ فعل دوبارہ ذکر نہیں کیا۔ بلکہ ان کی اطاعت کو اللہ اور رسول کی اطاعت کے ساتھ معطوف کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا حق ہے کہ اس کی مطلق اطاعت کی جائے۔ اور رسول اللہ ﷺ کا بھی یہی حق ہے کہ ان کی مطلق اطاعت کی جائے۔ کیونکہ دلائل میں یہی فعل بار بار آیا ہے۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ کی طرف سے جو بھی حکم صادر ہو، اس میں واجب ہے کہ اطاعت کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے ہدایت کو بھی آپ ﷺ کی اطاعت کے ساتھ معلق کیا ہے۔ فرمایا: وَإِن تُطِيعُوهُ تَهْتَدُواْ ’’اور اگر تم ان کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے۔‘‘

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ’’کہہ دو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی۔‘‘

اور اللہ تعالیٰ نے رسول ﷺ کی اس مطلق اطاعت کی علت بھی بیان کی کہ ’’وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتے۔‘‘ یعنی آپ ﷺ کی مطلق اطاعت اس لیے واجب ہے کہ جو کچھ آپ ﷺ کہتے ہیں وہ وحی ہے۔ ’’وہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتے، وہ تو وحی ہے جو ان پر اتاری جاتی ہے۔‘‘

اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ رسول جو کچھ دیں وہ لے لو۔ فرمایا: ’’جو کچھ رسول تمہیں دے وہ لے لو، اور جس چیز سے منع کریں اس سے رک جاؤ۔‘‘ بغیر کسی تفریق یا تقسیم کے۔ جب بھی رسول اللہ ﷺ سے کوئی چیز ثابت ہو جائے تو لازم ہے کہ ہم اسے لیں، اور جس سے روکیں اس سے رک جائیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے بارے میں جو اس اطاعت سے انحراف کرتے ہیں سخت وعید سنائی اور انہیں شدید عذاب سے ڈرایا۔ فرمایا: ’’اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور بچتے رہو۔ پھر اگر تم منہ موڑ لو تو جان لو کہ ہمارے رسول پر تو صرف واضح طور پر پہنچا دینا ہے۔‘‘

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ’’کہہ دو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی۔ پھر اگر وہ منہ موڑ لیں تو رسول پر صرف وہی ذمہ داری ہے جو ان پر ڈالی گئی ہے

اور تم پر وہ ذمہ داری ہے جو تم پر ڈالی گئی ہے۔ اور اگر تم ان کی اطاعت کرو تو ہدایت پاؤ گے، اور رسول پر تو صرف واضح پہنچا دینا ہے۔''

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔''

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی، ورنہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔'' اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے حکم کی مخالفت اور رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کبھی اعمال کے باطل ہونے کا سبب بن جاتی ہے۔اور سنتِ صحیحہ نے ہمیں خبر دی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت مطلق ہے۔ پس مطلق اطاعت صرف اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے لیے ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا:رسول اللہ ﷺ کی اطاعت واجب ہے کیونکہ ''جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔'' پس حلال وہی ہے جسے آپ ﷺ نے حلال قرار دیا، حرام وہی ہے جسے آپ ﷺ نے حرام قرار دیا، اور دین وہی ہے جو آپ ﷺ نے مشروع فرمایا۔ اور رسول اللہ ﷺ کے علاوہ جو علماء ہیں، مشائخ ہیں، امراء ہیں یا بادشاہ ہیں، ان کی اطاعت صرف اس وقت واجب ہے جب ان کی اطاعت دراصل اللہ کی اطاعت ہو۔ اور جب اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ان کی اطاعت کا حکم دیا ہے تو ان کی اطاعت دراصل رسول اللہ ﷺ کی اطاعت میں داخل ہے۔ یعنی اگر تم ولی الامر (حاکم) کا ایسا حکم مانتے ہو جو اللہ کے حکم کے خلاف نہ ہو تو یہ بھی اللہ کی اطاعت ہے۔ یہ ولی الامر کی خوشنودی یا ذاتی رضا کے لیے اطاعت نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں ہے جس نے ہمیں ان کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔(یہ تھا ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا کلام، ختم ہوا۔)

اور امام ابن قیم رحمہ اللہ نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت اور اپنے رسول کی اطاعت کا حکم دیا، اور رسول کی اطاعت کے ذکر میں فعلِ طاعت کو دوبارہ لایا، تاکہ یہ واضح کر دے کہ رسول کی اطاعت بذاتِ خود مستقل طور پر واجب ہے۔ اس کے لیے یہ شرط نہیں کہ پہلے اس کے حکم کو قرآن پر پیش کیا جائے۔جب بھی کوئی حدیث صحیح سند کے ساتھ ثابت ہو جائے تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ میں پہلے رسول اللہ ﷺ کے فرمان کو قرآن پر پیش کروں گا، بلکہ سیدھی سیدھی اطاعت لازم ہے۔ جب بھی سند صحیح ہو تو اطاعت واجب ہے، چاہے وہ بات قرآن میں موجود ہو یا نہ ہو۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ ایسی شریعت بھی مشروع کرتے ہیں جو قرآن میں مذکور نہیں۔ جیسے

گھریلو گدھوں کا گوشت حرام قرار دینا۔ یہ تحریم سنت میں صراحت کے ساتھ آئی ہے، قرآن میں اس کا ذکر نہیں۔ اسی طرح ہر درندے جس کے پاس نوکیلے دانت ہوں اور ہر شکاری پرندے جس کے پاس پنجہ ہو، ان سب کی حرمت سنت سے ثابت ہے۔ یہ سب ایسے مستقل احکام ہیں جو صرف سنت میں ملتے ہیں، قرآن میں نہیں۔

(یہ تھا ابن قیم رحمہ اللہ کا کلام، ختم ہوا۔)

اور سنت نے بھی اسی معنی کو مؤکد کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’اللہ کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں۔‘‘ اور فرمایا: ’’اطاعت صرف نیکی کے کام میں ہے۔‘‘ اور والیانِ امر کی اطاعت کے بارے میں فرمایا: ’’جب تک وہ معصیت کا حکم نہ دیں۔ اگر وہ معصیت کا حکم دیں تو نہ سننا ہے اور نہ اطاعت کرنی ہے۔‘‘

اور رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کا ذکر فرمایا جنہیں ایک امیر نے آگ میں داخل ہونے کا حکم دیا، اس بنیاد پر کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ اس کی اطاعت کرو۔ اس نے کہا: ’’کیا رسول اللہ ﷺ نے تمہیں میری اطاعت کا حکم نہیں دیا؟‘‘ انہوں نے کہا: ’’جی ہاں۔‘‘ اس نے کہا: ’’تو لکڑیاں جمع کرو۔‘‘ انہوں نے لکڑیاں جمع کیں۔ پھر کہا: ’’آگ جلاؤ۔‘‘ انہوں نے آگ جلائی۔ پھر کہا: ’’اس میں داخل ہو جاؤ۔‘‘ ان میں سے کچھ لوگ ارادہ کرنے لگے کہ آگ میں داخل ہو جائیں، لیکن بعض نے ایک دوسرے کو ٹھنڈا کیا اور کہا: ’’ہم تو آگ سے بھاگ کر آئے ہیں، اب اس میں کیسے داخل ہو جائیں؟‘‘ پھر جب یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ’’اگر وہ اس میں داخل ہو جاتے تو کبھی نہ نکلتے۔ اطاعت تو صرف نیکی کے کام میں ہے۔‘‘

اور صحیحین میں ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ’’میری اور تمہاری مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی کی جو اپنی قوم کے پاس آیا اور کہا: اے قوم! میں نے اپنی آنکھوں سے فوج کو دیکھا ہے اور میں تمہیں ڈرانے والا ہوں، سو تم بچاؤ کا بندوبست کر لو۔‘‘ تو اس کی قوم کا ایک گروہ اس کی اطاعت کرتا ہے، وہ رات کو چل پڑتے ہیں اور نجات پاتے ہیں۔ اور دوسرا گروہ اسے جھٹلاتا ہے اور اپنی جگہ پر رہتا ہے، صبح ان پر فوج حملہ آور ہوتی ہے اور انہیں ہلاک کر دیتی ہے۔ ’’یہ مثال ہے اس کی جو میری اطاعت کرتا ہے اور میری لائی ہوئی بات کی پیروی کرتا ہے۔ اور یہ مثال ہے اس کی جو میری

نافرمانی کرتا ہے اور میری لائی ہوئی حق بات کو جھٹلاتا ہے۔‘‘بلکہ نصوص نے یہ بھی واضح کیا کہ جو اطاعت نہیں کرتا وہ گویا جنت میں داخل ہونے سے انکار کرتا ہے۔ صحیح بخاری میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’میری امت سب جنت میں داخل ہوگی سوائے اس کے جو انکار کرے۔‘‘ صحابہ نے پوچھا: ’’یا رسول اللہ! کون انکار کرے گا؟‘‘ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوگا، اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے انکار کیا۔‘‘

رسول اللہ ﷺ کی اطاعت حتیٰ کہ عبادتی معاملات میں بھی واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ’’اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہو جب وہ تمہیں ایسی چیز کی طرف بلائیں جو تمہیں زندگی عطا کرتی ہے۔‘‘ یہ آیت دراصل دلائل کی تعظیم کے اصولوں میں سے ایک قاعدہ ہے، جو ان شاء اللہ آگے آئے گا۔

جب نبی ﷺ نے ابی (بن کعب) کو پکارا: ’’اے ابی‘‘ تو انہوں نے جواب نہ دیا۔ دوبارہ پکارا، پھر بھی جواب نہ دیا۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور کہا: ’’یا رسول اللہ! میں نماز پڑھ رہا تھا، اس لیے جواب نہ دیا۔‘‘ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’کیا اللہ نے یہ نہیں فرمایا: اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہو جب وہ تمہیں بلائیں‘

اور ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ نبی ﷺ منبر پر تشریف فرما تھے تو لوگوں سے فرمایا: ’’بیٹھ جاؤ۔‘‘ اس وقت ابن مسعود رضی اللہ عنہ مسجد کی طرف آ رہے تھے۔ آپ ﷺ کی آواز سنتے ہی فوراً راستے میں ہی بیٹھ گئے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ’’آ جاؤ اے ابن مسعود۔‘‘ یہ ان کی عظیم اطاعت تھی جو وہ نبی ﷺ کے لیے رکھتے تھے۔

یہ ہے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے بارے میں۔ خبردار! اللہ اور رسول ﷺ کے حکم کو کسی کے حکم پر پیش نہ کرو، چاہے وہ کوئی بھی ہو۔ لیکن ہم یہ بھی پاتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ہمیں غیر کی اطاعت کا بھی حکم دیا ہے۔

تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان غیر (یعنی حکمران، والدین، علماء وغیرہ) کی اطاعت کی حد کیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ: ’’اللہ اور رسول ﷺ کے علاوہ باقی سب کے لیے مطلق الطاعة (یعنی مکمل اطاعت) نہیں، بلکہ مطلق الطاعة بمعنیٰ بعض اطاعت ہے۔‘‘

اس پر فروع قائم ہوتے ہیں:

پہلا فرع: حکمرانوں کی اطاعت۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن و سنت میں ان کی اطاعت فرض کی ہے؟ جواب: جی ہاں۔ بلکہ سنت کی احادیث تواتر سے ان کی اطاعت کے وجوب پر دلالت کرتی ہیں۔

لیکن کیا حکمران کے لیے مطلق اطاعت ہے؟ جواب: نہیں۔ میں یہ نہیں مانتا کہ وہ اللہ ہے، نہ یہ مانتا ہوں کہ وہ رسول اللہ ﷺ ہے کہ میں اسے مطلق اطاعت کا مقام دوں۔ بلکہ اس کے لیے صرف مطلق الطاعة بمعنیٰ بعض اطاعت ہے، اور وہ بھی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے دائرے میں۔

چنانچہ جب بھی ہمیں کسی ایسی بات کا حکم دیا جائے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی پر مشتمل نہ ہو، تو اس وقت ہم کہتے ہیں: ہم نے سنا اور اطاعت کی۔ لیکن اگر ہمیں کسی ایسی بات کا حکم دیا جائے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے خلاف ہو، تو ہم کہتے ہیں: نہ سنیں گے اور نہ اطاعت کریں گے۔ اس لیے کہ ان کے لیے مطلق الطاعة نہیں بلکہ مطلق الطاعة الی الطاعة المطلقة ہے۔ چنانچہ جو شخص اس زمانے میں حکمرانوں پر مطلق اطاعت لازم کر دیتا ہے، اس کے دین اور عقیدے میں خرابی ہے۔ کیونکہ مطلق اطاعت صرف اللہ عز وجل اور اس کے رسول ﷺ کے لیے ہے۔ دوسروں کے لیے نہیں، ان کے لیے صرف مطلق اطاعت ہے۔ یہی وہ عقیدہ ہے جس پر ہم اللہ عز وجل کے دین کے طور پر قائم ہیں۔

دوسری فرع(شاخ): علماء کی اطاعت۔

اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم علماء کی اطاعت کریں، ان سے مسائل پوچھیں، ان کے فتووں کو قبول کریں اور امن و خوف کے معاملات ان کے سامنے پیش کریں۔ اور اللہ نے ہمیں ان سے پوچھنے کا حکم اسی لیے دیا ہے تاکہ ہم ان کے فتووں پر عمل کریں۔ جیسا کہ اللہ نے فرمایا: *اہلِ ذکر سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے۔* یعنی جب وہ فتویٰ دیں تو تم پر ان کی بات ماننا واجب ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ علماء کی اطاعت کی حدود کیا ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ: ان کی اطاعت بھی مطلق الطاعة علی الطاعة المطلقة ہے۔ تو جب بھی عالم کسی ایسی چیز کا حکم دے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے خلاف ہو، تو اس عالم کی نہ بات سنی جائے گی اور نہ اس کی اطاعت کی جائے گی۔

لیکن اگر وہ ایسی بات کا حکم دے جس میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت ہو، تو پھر سمعاً وطاعۃ۔

چنانچہ حکمرانوں نے اپنی ذوات کی وجہ سے اطاعت نہیں پائی، بلکہ اس وجہ سے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ہمیں ان کی اطاعت کا حکم دیا۔ اور علماء نے بھی اپنی ذات کی وجہ سے اطاعت حاصل نہیں کی بلکہ اس لیے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ہمیں ان کی اطاعت کا حکم دیا۔ ہم حاکم کی اطاعت اس لیے نہیں کرتے کہ وہ فلاں شخص ہے، بلکہ اس لیے کرتے ہیں کہ اللہ نے ہمیں اس کی اطاعت کا حکم دیا۔ اسی طرح ہم عالم کی اطاعت اس لیے نہیں کرتے کہ وہ فلاں یا فلاں ہے، بلکہ اس لیے کرتے ہیں کہ اللہ نے ہمیں اس کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔

اسی لیے علماء نے بیان کیا ہے کہ علماء اور امراء کی اطاعت میں اگر وہ کسی ایسی چیز کو حلال قرار دیں جسے اللہ نے حرام کیا ہے، یا کسی ایسی چیز کو حرام کریں جسے اللہ نے حلال کیا ہے، تو یہ عقیدے میں خرابی ہے جو انسان کو مکمل طور پر اسلام کے دائرے سے باہر نکال سکتی ہے۔ اسی لیے امام محمد رحمہ اللہ نے اپنی کتاب التوحید میں باب قائم کیا: *جس نے علماء کی اطاعت کی اللہ کی کسی آیت میں؟ ہاں، اس بات میں کہ وہ حرام کو حلال کر دیں یا حلال کو حرام کر دیں، تو اس نے انہیں کیا بنا لیا؟ ارباب۔* کیوں؟ اس لیے کہ اس نے ان پر مطلق اطاعت کا وصف چسپاں کر دیا، اور یہ ربوبیت کی صفت ہے۔

نبی ﷺ نے کیا مطلق اطاعت اس لیے حاصل کی کہ وہ محمد ہیں؟ جواب ہے: نہیں، ہرگز نہیں۔ بلکہ اس لیے کہ اللہ نے ان کی اطاعت ہم پر فرض کی اور ان کے حصے میں مطلق اطاعت کو واجب کیا۔ لہٰذا کسی نے بھی اپنی ذات کے سبب مطلق اطاعت حاصل نہیں کی، نہ مطلق طاعت۔ یہ صرف اللہ عز وجل کے لیے ہے۔ اللہ کی اطاعت اس لیے کی جاتی ہے کہ وہ اللہ ہے۔ اور ہمارے نبی ﷺ کی اطاعت اس لیے کی جاتی ہے کہ وہ رسول اللہ ہیں اور اللہ نے ان کی اطاعت کا ہمیں حکم دیا ہے۔ حکمران کی اطاعت اس لیے نہیں کی جاتی کہ وہ فلاں ہے، بلکہ اس لیے کی جاتی ہے کہ یہ اللہ کے حکم کی تعمیل ہے۔ اور یہی حال علماء کا بھی ہے۔

اسی لیے اللہ عز وجل نے فرمایا: *انہوں نے اپنے علماء اور راہبوں کو اللہ کے سوا رب بنا لیا۔* جب عدی بن حاتم نے یہ آیت سنی (جیسا کہ حدیث سنن ترمذی میں ہے)، تو اسے تعجب ہوا۔ اسے یاد نہ آیا کہ وہ علماء اور راہبوں کو سجدہ کرتا تھا، یا ان کے لیے رکوع کرتا تھا، یا ان کے لیے ذبح اور نذر کرتا تھا۔ اس نے

کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ، ہم تو انہیں عبادت نہیں کرتے تھے، ہم نے انہیں رب نہیں بنایا تھا، ہم نہ ان کے لیے ذبح کرتے تھے، نہ ان کے لیے نذر مانتے تھے، نہ ان کے گرد طواف کرتے تھے، نہ ان کے متعلق ایسے عقائد رکھتے تھے۔

تو نبی ﷺ نے وضاحت فرمائی کہ یہ ربوبیت کس چیز کی ہے؟ ربوبیتِ الطاعة المطلقة۔ فرمایا: کیا وہ تمہارے لیے حلال کو حرام نہیں کرتے تھے اور تم ان کی بات مان لیتے تھے؟ کیا وہ حرام کو حلال نہیں کرتے تھے اور تم اسے مان لیتے تھے؟ عدی نے کہا: جی ہاں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہی ان کی عبادت ہے۔

لہٰذا جو شخص بھی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے سوا کسی پر مطلق اطاعت لازم کر دیتا ہے، تو اس نے اسے اللہ کے ساتھ رب بنا لیا اور اسلام سے خارج ہو گیا، اگر وہ یہ اعتقاد رکھے کہ یہ شخص مطلق اطاعت کے لائق ہے۔ مطلق اطاعت کا مطلب یہ ہے کہ اس کی کسی بھی بات میں اس کی مخالفت جائز نہ ہو، چاہے وہ بات اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ ایسا شخص اسلام کی رسی اپنی گردن سے اتار پھینکتا ہے۔ یہ کفر ہے، یہ ارتداد ہے، اللہ کی پناہ!

پس اللہ ہی وہ ہے جس کی(الطاعة المطلقة) مطلق اطاعت کی جاتی ہے۔ اور نبی ﷺ بھی وہ ہیں جن کی مطلق اطاعت کی جاتی ہے انسانوں میں سے۔ ان کے علاوہ باقی سب کے لیے صرف مطلق الطاعة یعنی جزوی اطاعت ہے۔ اس کو اچھی طرح یاد کر لو۔

کتاب اللہ کے دلائل مطلق اطاعت کے لائق ہیں۔ صحیح سنت کے دلائل مطلق اطاعت کے لائق ہیں۔ یہی ہم کہنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا تمہارے لیے جائز نہیں کہ تم دلائل کو، جن کا حق ہے کہ ان کی مطلق اطاعت کی جائے، چھوڑ کر ان لوگوں کی بات پر عمل کرو جن کی صرف مطلق الطاعة ہے۔ یہ بہت بڑی خرابی ہے تمہارے دین، تمہارے عقیدے اور تمہارے علمی منہج میں۔ تم کس طرح اللہ کے قول کو، جس کی مطلق اطاعت واجب ہے، چھوڑ دیتے ہو؟ کس طرح تم رسول اللہ ﷺ کے قول کو، جس کی مطلق اطاعت واجب ہے، چھوڑ دیتے ہو اور کسی عالم یا فلاں مجتہد کے قول کو مقدم کر دیتے ہو حالانکہ ان کے لیے صرف مطلق الطاعة ہے نہ کہ مطلق اطاعت۔ یہ بہت بڑی خرابی ہے (اے شیخ فہد،) اللہ کی قسم۔

اسی لیے ہم اللہ عز وجل کے دین کے مطابق یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حکمرانوں کے لیے صرف مطلق الطاعۃ ہے اور علماء کے لیے بھی صرف مطلق الطاعۃ ہے۔

تیسری شاخ: والدین کی اطاعت۔

اللہ عز وجل نے والدین کی اطاعت کا حکم دیا ہے، ان کے ساتھ نیک سلوک اور ان کی عزت کرنے کا حکم دیا ہے، اور ان کی نافرمانی کو حرام قرار دیا ہے۔ کیا یہ بات درست نہیں؟ جواب ہے: جی ہاں۔ نبی ﷺ نے فرمایا: "والدین کی نافرمانی نہ کرو، خواہ وہ تمہیں اپنے اہل و مال سے نکلنے کا حکم دیں۔" (یہ حدیث امام احمدؒ کے مسند میں معاذ رضی اللہ عنہ سے حسن لغیرہ سند کے ساتھ مروی ہے۔)

تو سوال یہ ہے کہ والدین کی اطاعت کی حدود کیا ہیں؟ جواب: وہ بھی مطلق الطاعۃ علی الطاعۃ المطلقۃ ہیں۔ یعنی جن کی اطاعت کا اللہ نے حکم دیا ہے، سوائے رسول اللہ ﷺ کے، ان سب کے لیے جزوی اطاعت ہے نہ کہ مطلق اطاعت۔ پس جب بھی والدین اپنی اولاد کو کسی معصیت کا حکم دیں، تو اس وقت نہ سننا ہے نہ ماننا ہے۔ لیکن دنیا میں ان کے ساتھ اچھا سلوک جاری رکھنا ہے۔ اس کی دلیل اللہ کا یہ قول ہے: ﴿وَإِن جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۖ وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا ۖ وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ﴾(سورۃ لقمان، 31:15) *اور اگر وہ دونوں تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ اس چیز کو شریک ٹھہرائے جس کا تجھے علم نہیں، تو ان کی اطاعت نہ کر، لیکن دنیا میں ان کے ساتھ اچھے طریقے سے رہ۔ اور اس کی راہ اختیار کر جو میری طرف رجوع کرتا ہے۔*

اس آیت کے نزول کا سبب یہ ہے کہ سعد بن ابی وقاص کی والدہ نے جب وہ اسلام لے آئے تو کہا: اللہ کی قسم! میں نہ سایے میں بیٹھوں گی، نہ کھانا کھاؤں گی جب تک تو محمد ﷺ کے دین کو نہ چھوڑ دے۔

چنانچہ وہ (سعد بن ابی وقاصؓ کی والدہ) کئی دن تک کچھ نہ کھاتی یہاں تک کہ بے ہوش ہوکر گرنے لگتی۔ سعدؓ اسے بار بار کھلانے کی کوشش کرتے اور کہتے: اے ماں! کچھ کھالو، مگر وہ انکار کرتی رہتی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ وہ بضد ہے تو کہا: خدا کی قسم! اگر تیری دس جانیں بھی ہوں اور ایک ایک کرکے نکل جائیں، تب بھی میں محمد ﷺ کے دین سے نہیں پلٹوں گا۔ (عربی محاورے کے

مطابق کہا) ہاں، اگر تجھے زبردستی کرنی ہے تو کرلے۔ پھر وہ دعا دیتی اور کھا لیتی۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔(صحیح مسلم 1748)

پس جب بھی تمہیں تمہارے والد کسی ایسی چیز کا حکم دیں جو اللہ کی معصیت ہے تو خبردار! کبھی یہ نہ کہنا کہ "سمعنا واطعنا" اس لیے کہ وہ والد ہیں۔ خبردار رہنا! اللہ کی اطاعت، والدین کی اطاعت پر مقدم ہے۔

اور انہی فروع میں ایک مسئلہ تمذہب (کسی ایک فقہی مکتب کی پابندی) کا ہے۔ یعنی کیا کسی مذہب کی پیروی کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر تمھاری مراد "مطلق الطاعۃ" (یعنی مشروط اطاعت) ہو نہ کہ "الطاعۃ المطلقۃ" (یعنی مطلق اطاعت)، تو جائز ہے۔ لیکن اگر کسی مذہب کی پیروی سے مراد یہ ہے کہ اس کے ہر قول کو مطلق اطاعت کے درجے میں مانا جائے، تو یہ درست نہیں۔

کسی مذہب کو اپنانے کا یہی طریقہ ہے یعنی اگر تمھاری مراد یہ ہے کہ تم ایک مذہب کے مسائل پر عمل کروگے جب تک وہ کتاب و سنت کے موافق ہوں، تو یہ جائز ہے۔ لیکن جب کبھی اس کے کسی مسئلے کی مخالفت کتاب و سنت سے ثابت ہو جائے تو تم پر لازم ہے کہ اس کو رد کردو۔ پورے مذہب کو رد نہ کرو، بلکہ اس ایک مسئلے میں اس قول کی پیروی نہ کرو۔اور انہی فروع میں امام ابن تیمیہؒ کا ایک عظیم کلمہ ہے۔ سنو، انہوں نے فرمایا: کتاب، سنت اور اجماع سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اور اپنے رسول ﷺ کی اطاعت فرض کی ہے، اور اس امت پر یہ لازم نہیں کیا کہ وہ کسی ایک شخص کی ہر بات میں اطاعت کرے سوائے رسول اللہ ﷺ کے۔ یہاں تک کہ اس امت کے سب سے بڑے اور نبی کے بعد سب سے افضل شخص، یعنی ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا: "میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ کی اطاعت کروں، اگر میں نے اللہ کی نافرمانی کی تو میری اطاعت تم پر نہیں ہے۔" اور سب کا اتفاق ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کوئی بھی معصوم نہیں کہ ہر بات میں اس کی اطاعت واجب ہو۔ (انتہیٰ)

اسی طرح ایک اور فرع: اللہ نے بیوی پر اپنے شوہر کی اطاعت فرض کی ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ بیوی کی اطاعت کی حد کیا ہے؟ جواب: مطلق الطاعۃ (یعنی مشروط اطاعت)، نہ کہ الطاعۃ المطلقۃ (یعنی مطلق اطاعت)۔ چنانچہ اگر شوہر اپنی بیوی کو ایسی بات کا حکم دے جس میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی ہو تو بیوی کو چاہیے کہ کہے: "میں اللہ اور رسول ﷺ کے فرمان کو زیادہ عظمت دیتی ہوں، اس لیے اس بات کو ماننے سے معذرت کرتی ہوں، کیونکہ تمہاری اطاعت میرے اوپر صرف مطلق الطاعۃ کی حد تک ہے، نہ کہ الطاعۃ المطلقۃ۔"

اور انہی فروع میں یہ بھی ہے: جان لو کہ لوگوں کے اقوال کو فیصلے کے طور پر قبول کرنا درست نہیں، کیونکہ جس کی اطاعت صرف "مطلق" ہے اس کا قول کسی نزاع میں فیصلہ نہیں بن سکتا۔ علماء کے اقوال دلیل کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں، لیکن وہ بذاتِ خود دلیل نہیں ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ انہیں صرف "مطلق الطاعۃ" حاصل ہے، نہ کہ "الطاعۃ المطلقۃ"۔ اسی لیے علماء کے اقوال کو ہم فیصلہ کن درجہ نہیں دیتے بلکہ یہ درجہ صرف رسول اللہ ﷺ کے قول کے لیے خاص ہے۔ اور کیوں رسول اللہ ﷺ کا قول فیصلے کے طور پر مانا جاتا ہے؟ اس لیے کہ آپ ﷺ کی اطاعت "الطاعۃ المطلقۃ" ہے۔

یہاں تک کہ صحابہ کرامؓ کا قول بھی فیصلے کا درجہ نہیں رکھتا، کیونکہ ان کے لیے بھی اطاعت صرف "مطلق الطاعۃ" ہے، نہ کہ "الطاعۃ المطلقۃ"۔ اسی لیے ابن تیمیہؒ نے فرمایا: "کسی کو بھی یہ حق نہیں کہ وہ کسی ایک شخص کے قول کو مسائلِ نزاع میں حجت بنائے، کیونکہ اس کے لیے اطاعت صرف مطلق ہے، نہ کہ مطلق اطاعت۔" حجت تو صرف نص (قرآن و سنت) اور اجماع میں ہے۔ (انتہیٰ)

اور ایک فرع یہ ہے: ابن تیمیہؒ سے پوچھا گیا کہ عورت کے لیے قبرستان کی زیارت کا کیا حکم ہے؟ دیکھو، انہوں نے کس قوت سے اسی قاعدے (الطاعۃ المطلقۃ ومطلق الطاعۃ) پر جواب دیا : سب سے پہلے ہمیں یہ جان لینا چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ کے قول کو کسی کے قول کی وجہ سے رد نہیں کیا جا سکتا، چاہے وہ کوئی بھی ہو۔ اگرچہ سوال عائشہؓ کے بارے میں تھا کہ انہوں نے اپنے بھائی عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی قبر کی زیارت کی، لیکن ابن تیمیہؒ نے ادباً عائشہ رضی اللہ عنہا کا نام نہیں لیا بلکہ عمومی قاعدہ بیان کیا۔ فرمایا: "رسول اللہ ﷺ کے قول کو کسی کے قول سے معارض نہیں کیا جا سکتا۔" اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّـهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ *"اور کسی مومن مرد یا عورت کے لیے یہ جائز نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کوئی حکم دے تو ان کے لیے اپنے معاملے میں کوئی اختیار باقی رہے۔"* اور اللہ کا فرمان ہے: "فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ" *"اگر کسی چیز میں نزاع کرو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ۔*"

اس لیے نبی ﷺ نے جب عورتوں پر لعنت فرمائی جو قبروں کی زیارت کرتی ہیں، تو عائشہؓ کے فعل کو اس کے مقابل نہیں رکھا جا سکتا۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ (صحابہ کرامؓ) معصوم نہیں تھے، ان سے خطا ہوسکتی ہے، یا انہیں حدیث پہنچی

نہ ہو، یا پہنچی ہو اور بھول گئی ہوں، یا کسی اور وجہ سے تاویل کرلی ہو۔ لیکن نصِ صریح میں کبھی عذر پیش نہیں کیا جاتا۔ یہی تو علم ہے!

معافی یا بہانہ کرنے کا تعلق صحیح نصوص سے نہیں ہے۔ ہم ایسے نہیں ہیں جیسے عورتیں جو اپنے چہرے چھپاتی ہیں اور نصوص کے لیے بہانے تلاش کرتی ہیں۔ خاص کر نصوص جہاد کے بارے میں ، اور ان نصوص سے مراد یہ نہیں کہ یہ صرف پہلے کے عہد میں تھیں یا صرف کسی مخصوص وقت کے لیے ہیں، بلکہ اصل غلطی ان کی تطبیقات میں ہے۔ لوگ نصوص کو غلط طریقے سے منسوب کرتے ہیں اور ان کے لیے بہانے ڈھونڈتے ہیں، اور بعض کہتے ہیں کہ کاش ہم ایسی آیات کو مٹا دیتے جن میں خون بہانے کا ذکر ہے۔

کچھ لوگ باطنی طور پر ہار مان لیتے ہیں، وہ شرماتے ہیں کہ اپنے دلائل پیش کریں یا کہیں کہ یہ ہمارے پاس قرآن و سنت سے ہیں۔ یہ باطنی شکست ہے۔ معافی یا عذر صرف اس شخص کے لیے جائز ہے جو نصوص کی مخالفت اس لیے کر رہا ہو کہ اس کے نیت میں حق کی رغبت ہو اور اس کے پاس کوئی عذر موجود ہو ۔ لیکن اگر اس کی نیت معاندانہ ہو اور وہ نصوص کی جان بوجھ کر مخالفت کرے، تو اسے کوئی عذر نہیں دیا جائے گا۔

ابھی لوگ شرماتے ہیں کہ اپنے دلائل پیش کریں، چاہے وہ کسی محفل، کانفرنس یا درسگاہ میں ہوں، کبھی کبھار انسان خوفزدہ ہو جاتا ہے تاکہ لوگ اس پر سوالات نہ کریں۔ یہ سب باطنی شکست اور نفس کی کمزوری ہے۔

شاید تم بھول گئے ہو کہ آیا یہ حدیث تم تک پہنچی یا تم نے اسے غلط سمجھا یا اس کی تاویل کی۔

ایک اور قاعدہ: "ہر شخص کی بات لی بھی جاتی ہے اور رد بھی کی جاتی ہے، سوائے شارع (رسول ﷺ) کے قول کے۔"

ائمہ اربعہ اور دیگر ائمہ سب اپنے شاگردوں کو یہی وصیت کرتے تھے کہ ان کے اقوال اس وقت تک قبول کیے جائیں جب تک وہ حدیث کے موافق ہوں۔ اگر کبھی ان کے اقوال حدیث کے خلاف ہوں تو انہیں چھوڑ دینا۔

چنانچہ امام الشافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ: "اگر حدیث صحیح ہو تو یہی میرا مذہب ہے۔" اور میں نے یہ بات آپ کو کچھ دیر پہلے بھی بیان کی تھی۔ ان سے یہ بھی روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: "اگر تم میرے قول کو دیکھو جو کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے متصادم ہو، تو میرے قول کو نظرانداز کر دو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کو اختیار کرو۔" یعنی میرے قول کو بالکل رد کر دو۔

یہی بات امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں بھی نقل ہوئی ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: "میں بھی صرف ایک انسان ہوں، میں غلطی کرتا اور صحیح بھی کہتا ہوں، لہٰذا میرے قول پر غور کرو۔ جو بات قرآن و سنت کے مطابق ہو اسے اختیار کرو اور جو اس کے خلاف ہو اسے چھوڑ دو۔"

بعد میں، بعض متأخر علماء کے نزدیک یہ مشہور ہو گیا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہر شخص کے قول سے استفادہ کیا جا سکتا ہے، لیکن صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کو ترجیح دی جاتی ہے۔

اس قول کی صحت کو امام ابن عبد الهادی نے اپنی کتاب *ارشاد السالك* میں درست قرار دیا۔ اسے امام ابن عبدالبر نے *الجامعی* میں بھی روایت کیا اور امام ابن حزم نے اپنی کتاب *اصول الاحکام* میں ابن عیینہ اور مجاہد کے قول سے نقل کیا۔ اس کے علاوہ امام السبکی نے بھی اس قول کی تصدیق کی ہے۔ بلکہ بعض روایات میں یہ قول مرفوعاً ابن عباس رضی اللہ عنہ تک بھی پہنچایا گیا ہے، لیکن اس کی سند میں کچھ مسائل ہیں۔

اور جب ابن عباسؓ نے حج تمتع کے مسئلے میں اختلاف کیا تو انہوں نے مشہور جملہ کہا: ''عنقریب تم پر آسمان سے پتھر برسیں گے! میں کہتا ہوں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اور تم کہتے ہو ابو بکرؓ و عمرؓ نے کہا۔'' اور اس بارے میں ائمہ کے اقوال بہت زیادہ ہیں۔ ابن حزمؒ نے اپنی کتاب *الآداب* میں اس بارے میں بہت سی باتیں کہی ہیں، شاید آپ اس کی طرف رجوع کریں۔

تو تمہارے لیے جائز نہیں کہ تم علماء کے اقوال کو اس نظر سے دیکھو کہ وہ معصوم ہیں، اور یہ کہ ان میں کبھی خطا نہیں ہوگی، یا ان کے اقوال پر کبھی اعتراض نہیں کیا جاسکتا، یا ان پر بحث نہیں ہوسکتی۔ بلکہ ہر عالم کا قول ان تین احتمالات سے خالی نہیں: یا تو وہ قبول کیا جائے گا، یا رد کیا جائے گا، یا کسی دوسرے قول سے معارض ہوگا۔ کوئی ایسا عالم نہیں جس کا ہر قول مطلق طور پر قبول کرنا لازم ہو۔

ابن تیمیہؒ نے فرمایا: ''ایسا کوئی شخص نہیں گزرا ائمہ میں سے، خواہ وہ پہلے ہوں یا بعد کے، مگر یہ کہ ان کے کچھ اقوال و افعال میں ان سے سنت چھوٹ گئی۔'' امام ابن عبدالبرؒ نے اس قاعدے پر کلام کرتے ہوئے کہا: ''یہ اہلِ علم کا اجماع ہے، مجھے اس میں کوئی اختلاف معلوم نہیں۔'' یعنی ہمارا یہ اصول تمام علماء کے درمیان متفق علیہ ہے۔ اور نبی کریم ﷺ اور صحابہ سے بھی اس معنی میں کچھ روایات آئی ہیں جن پر غور کرنا چاہیے۔

چنانچہ کثیر بن عبداللہ بن عمرو بن عوف المزنی نے اپنے والد سے اور انہوں نے اپنے دادا سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بے شک میں اپنی امت پر اپنے بعد تین چیزوں کا خوف رکھتا ہوں۔'' صحابہؓ نے کہا: وہ کیا ہیں یا رسول اللہ؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایک عالم کی لغزش، دوسرا ظالم حاکم، اور تیسرا خواہشِ نفس کی پیروی۔'' امام ابن عبدالبرؒ نے اسے حسن قرار دیا۔

امام دارمی نے صحیح سند سے روایت کیا کہ زیاد بن حدیر کہتے ہیں: عمر بن خطابؓ نے مجھ سے کہا: ''اے زیاد! کیا تم جانتے ہو اسلام کو کیا چیز گرا دیتی ہے؟'' میں نے کہا: ''نہیں۔'' انہوں نے کہا: ''اسلام کو تین چیزیں گراتی ہیں: عالم کی لغزش، منافق کا قرآن کے ساتھ جھگڑا، اور ائمہ گمراہوں کی حکومت۔''

عالم کی لغزش کیا ہے؟ یعنی عالم نے کوئی غلط بات کہی جو نبی ﷺ کے قول کے خلاف ہے اور عوام نے اس کو قبول کرلیا۔ تو یہ عالم کی لغزش ہے۔ اس نے کسی حرام کو حلال یا کسی حلال کو حرام کہہ دیا اور عوام نے اس کو تھام لیا۔ اللہ کی پناہ! یہ بہت خطرناک مقام ہے۔ اسی لیے عالم اور طالبِ علم کو چاہیے کہ اپنے اقوال کو خوب پرکھے، کیونکہ یہ باقی رہ جائیں گے، سینوں میں محفوظ ہوں گے، زبانوں پر چڑھیں گے اور دنیا بھر میں پھیل جائیں گے، خاص طور پر آج کے دور میں کہ آپ کی بات ایک بٹن دبانے سے دنیا کے کناروں تک پہنچ جاتی ہے۔

تو اے عالم! اللہ سے ڈرو! ہو سکتا ہے تم اپنی بات کا بعد میں اصلاح کرلو جبکہ سننے والے کم تھے، مگر اگر یہ بات پھیل گئی اور لوگوں نے اسے اختیار کرلیا تو پھر سنبھالنا مشکل ہے۔ خصوصاً وہ لوگ جو خواہشات کے پیچھے ہیں، وہ تمہاری لغزش پر خوش ہوں گے۔ اس لیے عالم کو چاہیے کہ وہ اللہ کے دین میں صرف رضائے الٰہی کو مدنظر رکھے، نہ کہ لوگوں کو خوش کرنے کے لیے فتوے دے۔ کیونکہ عالم ''اللہ کی طرف سے دستخط کرنے والا'' ہے۔

عمر بن خطابؓ نے فرمایا: ’’کیا تم جانتے ہو اسلام کو کیا چیز گراتی ہے؟‘‘ میں نے کہا: ’’نہیں۔‘‘ فرمایا: ’’اسلام کو تین چیزیں گراتی ہیں: عالم کی لغزش، منافق کا قرآن کے ساتھ جھگڑا، اور خواہش کی پیروی۔‘‘

منافق کا خطرہ کافروں سے زیادہ کیوں ہے؟ اس لیے کہ کافر تو اسلام کو کفر کے ذریعے نقصان پہنچاتا ہے، لیکن منافق اسلام کو اسلام کے ذریعے نقصان پہنچاتا ہے۔ وہ ایک آیت کو دوسری آیت کے مقابلے میں لاتا ہے، ایک حدیث کو دوسری آیت کے مقابلے میں رکھتا ہے۔ مثلاً عورت کے چہرہ ڈھانپنے کے مسئلے پر وہ کچھ آیات و احادیث لاتا ہے اور اس طرح اسلام کو اسلام ہی کے ذریعے کمزور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منافقین کا خطرہ امت پر کفار سے بھی زیادہ ہے۔

حسن بصریؒ نے کہا: ’’میں تم پر تین چیزوں کا ڈر رکھتا ہوں: عالم کی لغزش، منافق کا قرآن کے ساتھ جھگڑا، اور خواہشِ نفس کی پیروی۔‘‘ ابو الدرداءؓ نے فرمایا: ’’مجھے تم پر عالم کی لغزش کا ڈر ہے۔‘‘

اسی طرح معاذ بن جبلؓ اپنے خطبے میں کہا کرتے: ’’بے شک تمہارے آگے ایک وقت آنے والا ہے کہ قرآن بکثرت پڑھا جائے گا۔ اسے مومن، منافق، عورت، بچہ، سب پڑھیں گے۔ تو قریب ہے کہ کوئی کہے: میں نے قرآن پڑھا ہے، مگر مجھے کوئی میرا متبع نظر نہیں آتا۔‘‘ تو وہ نئے نئے کام ایجاد کرے گا تاکہ لوگ اس کے پیروکار بن جائیں۔ تو بچو ہر بدعت سے، کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے۔ اسی طرح کہا گیا: ’’حکیم (عالم) کی لغزش سے بچو۔‘‘ کیونکہ کبھی شیطان عالم کی زبان سے گمراہی کی بات کہلواتا ہے۔ اور کبھی منافق حق کی بات کرتا ہے۔ اس لیے حق جس کے پاس بھی ہو اسے قبول کرو۔

علماء نے کہا: ’’عالم کی لغزش یہ ہے کہ وہ کوئی ایسی بات کہہ دے جسے سن کر تم چونک جاؤ اور کہو: یہ کیا بات ہے؟‘‘ تو ایسی لغزش سے بچو اور وہ تمہیں اللہ کے راستے سے نہ روک دے۔ ان تمام احادیث میں ’’عالم کی لغزش‘‘ سے مراد یہ ہے کہ لوگ اس کی غلطی پر جم جائیں اور اس کی پیروی کریں۔ اس سے ڈرنے اور بچنے کی ضرورت ہے۔اسی لیے کہا گیا کہ: ’’ہر شخص کی بات لی بھی جائے گی اور چھوڑی بھی جائے گی، سوائے نبی کریم ﷺ کے۔‘‘

علماء کا اتفاق ہے کہ انبیاء کے سوا کوئی معصوم نہیں، نہ خطا سے نہ غلطی سے۔ صرف رسول اللہ ﷺ معصوم ہیں اس چیز میں جو آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہنچاتے ہیں، کیونکہ رسالت کا مقصد ہی عصمت کے بغیر پورا نہیں ہوسکتا۔

ابن تیمیہؒ نے فرمایا: ''جان لو کہ کوئی بھی امام، جسے عام قبولیت ملی ہو، وہ جان بوجھ کر رسول اللہ ﷺ کی سنت کی مخالفت نہیں کرتا۔''

شیخ عبدالرحمن بن محمد بن عبدالوہابؒ نے کہا: ''ہر مکلف پر واجب ہے کہ جب اللہ کی کتاب یا رسول اللہ ﷺ کی سنت سے دلیل اس تک پہنچے اور وہ اس کے معنی کو سمجھ لے، تو وہ اسی پر عمل کرے، خواہ اس کے خلاف کوئی اور بھی ہو۔''

اسی طرح امام شافعیؒ نے کہا: ''مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ جس کو رسول اللہ ﷺ کی سنت واضح ہو جائے، اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ اسے کسی دوسرے کے قول کی وجہ سے چھوڑ دے۔'' علماء نے اس اصول پر کئی فروع قائم کیے، ان میں سے ایک یہ ہے: عوام کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی عالم کی پیروی کریں جبکہ انہیں اس کے قول کا غلط ہونا معلوم ہو گیا ہو۔ اور یہ کہ عوام ہر کسی سے سوال نہ کریں بلکہ صرف اہلِ علم راسخین سے رجوع کریں۔

ایک اور قاعدہ یہ ہے: ''ہر وہ اصول یا قاعدہ جو دلائل کے خلاف قائم کیا گیا ہو یا ان کی مخالفت پر مبنی ہو، وہ باطل ہے اور اسے رد کرنا واجب ہے۔'' 43:48

چنانچہ اگر کسی بھی مذہب میں کوئی قاعدہ ہو اور اس پر عمل کرنے سے نصوص باطل قرار پائیں یا کمزور ہوں، تو جان لو کہ وہ قاعدہ باطل ہے۔ اور طالب علم پر واجب ہے کہ اسے رد کرے اور دوسروں کو بھی اس سے بچائے۔ چاہے وہ قاعدہ بڑے سے بڑے امام نے ہی کیوں نہ کہا ہو۔ اس میں کوئی خیر نہیں، نہ ابتدا میں اور نہ انتہا میں۔

اور جیسا کہ ابن القیمؒ نے فرمایا: "واللہ! ہم ایک ہزار اصولوں پر نادم ہونا پسند کریں گے لیکن ایک دلیل گھڑنے پر راضی نہیں ہوں گے۔"

میں تمہیں کچھ مثالیں دیتا ہوں ایسی اصولی قواعد کی جو بعض مذاہب میں مقرر کی گئی ہیں، لیکن اے طالب علم! ان پر عمل کرنے سے بچنا۔ ان سے بچو! کیونکہ بندۂ ضعیف کے استقراء اور مطالعہ کے مطابق ہم نے دیکھا ہے کہ ان پر عمل کرنا صحیح احادیث کو رد کرنے کا باعث بنتا ہے۔

ان میں سے ایک وہ قاعدہ ہے جو ائمہ احناف رحمہم اللہ نے مقرر کیا ہے: اذا تعارض الراوي وروايته فرأيه مقدم على روايته "جب راوی (کا عمل) اور اس کی روایت میں تعارض ہو تو رائے مقدم ہوگی۔" یہ ان کے ہاں قاعدہ ہے۔ اسی بنا پر انہوں نے بہت سی نصوص کو رد کر دیا۔

جبکہ دیگر ائمہ—مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ—کا قول یہ ہے کہ جب رواى کی رائے اور روایت میں تعارض ہو تو روایت کو رائے پر مقدم رکھا جائے گا۔ لیکن احناف نے معاملہ الٹ کر دیا۔ ان کے پاس اس کی کچھ عقلی اور اجتہادی وجوہات ہیں، اور ان کا مقصد ہرگز سنت کی مخالفت نہیں، بلکہ جیسا کہ ابن تیمیہؒ نے کہا تھا، ان کی نیت یہ نہیں تھی کہ سنت کے خلاف جائیں، لیکن یہ اللہ کی تقدیر تھی کہ وہ اس طرف چلے گئے۔ اسی بنا پر انہوں نے صحیحین میں موجود ابو ہریرہؓ کی حدیث کو رد کیا جس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اگر کتا تم میں سے کسی کے برتن میں پی لے تو اسے سات بار دھوؤ۔" اس پر جمہور نے عمل کیا لیکن احناف نے کہا: ہم اس کو نہیں لیتے، حتیٰ کہ اگر یہ صحیحین میں ہو تب بھی نہیں۔ کیوں؟ کیونکہ راوی یعنی ابو ہریرہؓ سے یہ بھی ثابت ہے کہ وہ کتے کے برتن کو صرف تین بار دھوتے تھے، سات بار نہیں۔

تو ہمارے سامنے ایک طرف روایت ہے اور دوسری طرف راوی کی اپنی رائے۔ اب عصمت کہاں ہے؟ رائے میں یا روایت میں؟ اگر ہمارے پاس رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے اور غیر رسول کی رائے ہے، تو کس کو ترجیح دیں گے؟ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کو یا غیر رسول کی رائے کو؟ قیامت کے دن سوال بھی روایت کے بارے میں ہوگا، رائے کے بارے میں نہیں۔

لہٰذا ابو ہریرہؓ کو ہم معذور سمجھتے ہیں کہ شاید وہ اپنی روایت کو بھول گئے ہوں، یا ان کے نزدیک کوئی اور معارض قوی تر ہو، یا یہ کہ انہوں نے سمجھا کہ سات بار دھونا وجوب کے بجائے استحباب پر محمول ہے، اور اسی طرح کے دوسرے احتمالات۔ لیکن بہرحال روایت محفوظ اور صاف ہے، اور واجب ہے کہ اسے لیا جائے۔پس احناف نے اس صحیح حدیث کو رد کیوں کیا؟ اسی فاسد قاعدے کی وجہ سے۔ اور ہر وہ قاعدہ جو قولِ رسول ﷺ کے خلاف لے جائے، وہ باطل ہے۔

اسی طرح مالکیہ کا قاعدہ ہے: "اگر حدیثِ آحاد اہلِ مدینہ کے عمل کے خلاف ہو تو اہلِ مدینہ کے عمل کو مقدم کیا جائے گا۔" لیکن اگر ہم اس قاعدے پر عمل کریں تو بہت سے نصوص کا رد لازم آتا ہے۔ اور چونکہ اس کا نتیجہ نصوص کے رد پر منتج ہوتا ہے، لہٰذا یہ قاعدہ بھی باطل ہے۔چنانچہ اگر اہلِ مکہ کسی حدیث کے

خلاف عمل کریں تو ہم ان کا عمل رد کریں گے اور حدیث لیں گے۔ اگر اہلِ مدینہ بھی کسی حدیث کے خلاف عمل کریں تو ان کا عمل رد کریں گے اور حدیث کو لیں گے۔ یہی اصل میں دلیل کی تعظیم ہے، کہ اسے کسی کے قول سے ٹکرانے نہ دیا جائے، خواہ کوئی بھی ہو۔

یہ جائز نہیں کہ ہم اسے کسی کے قول کے ساتھ، چاہے وہ کوئی بھی ہو، متعارض قرار دیں۔ اور اسی طرح، ایک اور شاخ بھی ہے۔ میں نے آپ کو مثالیں دی ہیں جہاں اہلِ مدینہ کے عمل کی مخالفت کی گئی، جیسے خیارمجلس کے مسئلہ میں اور خطبہ جمعہ کے دوران دو رکعت نماز میں،

اور اسلامی فقہ میں بعض مذاہب میں جو بعض قواعد ہیں، وہ باطل ہیں۔ ویسے درست اصول شافعیہ اور حنابلہ ہیں، کیونکہ ان میں شاذ و نادر ہی کوئی ایسا اصول ملتا ہے جس میں کسی نص کو رد کرنے کی ہدایت ہو۔ لہٰذا جو شخص فقہ کے اصول طلب کرنا چاہے، اس چاہیے کہ وہ حنابلہ یا شوافع کے اصول طلب کرے، کیونکہ ان کے اصول درست اور قابل اعتماد ہیں، رحمهم الله تعالیٰ۔

اسی طرح ایک اور قاعدہ جو احناف کے ہاں ہے: "خبر واحد ان مسائل میں مردود ہے جن میں عام ابتلاء پایا جاتا ہے۔" یعنی اگر کوئی مسئلہ ایسا ہو جس کی ضرورت سب کو ہو اور سبھی کثرت سے اس کے بارے میں پوچھیں، لیکن اس پر صرف ایک صحابی سے روایت ہو تو اس کی روایت ناقابلِ اعتماد ہوگی۔ یہ بھی محض رائے ہے جس سے انہوں نے نصوص کی مخالفت کی۔ اس لیے ان کو "اہل الرأي" کہا گیا، کہ ان کے ہاں رائے کو نصوص پر مقدم کر دیا جاتا ہے۔

جبکہ جمہور—مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ—کا قول یہ ہے کہ خبر واحد اگر صحیح ہو تو وہ ایسے مسائل میں بھی قابلِ قبول ہے، خواہ عام ابتلاء پایا جاتا ہو یا نہ پایا جاتا ہو۔

مثلاً احناف نے احادیث رد کر دیں جن میں آیا ہے کہ عضوِ خاص کو چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ حالانکہ یہ احادیث صحیح ہیں، لیکن انہوں نے کہا: یہ خبر آحاد ہیں اور مسئلہ ایسا ہے جس میں عام ابتلاء ہے، اس لیے ہم انہیں قبول نہیں کرتے۔

(البلوی: ایسے معاملات یا احکام ہیں جو وسیع سطح پر نافذ ہوتے ہیں یا عمومی فلاح و فائدے سے تعلق رکھتے ہیں۔)

اور ہم نے بڑے ادب سے اس کو بیان کیا، اس لیے کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی حدیث کو رد کرے جو صحیح ثابت ہوئی ہو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم

سے منقول ہو، صرف اس لیے کہ امام نے اس کے خلاف کچھ کہا ہو۔ اس لیے ائمۂ حنفیہ کا اس قاعدے کی تصدیق کرنا ایک غلطی ہے۔ ضروری ہے کہ حنفی علماء اسے درست کریں۔

اسی طرح احناف کے ہاں ایک اور قاعدہ یہ ہے: الزيادة على النص نسخ "نص پر زیادتی نسخ ہے۔" یعنی اگر قرآن نے کسی مسئلے پر حکم دیا اور پھر سنت نے اس میں کوئی شرط یا قید لگا دی، تو وہ زیادتی نسخ ہے، اور چونکہ سنت قرآن کو منسوخ نہیں کر سکتی، اس لیے وہ زیادتی مردود ہے۔

(شیخ نے جب اپنی درس میں احناف کے اصولوں کا رد کیا۔۔ تو ساتھ ہی ائمہ احناف کو دعائیں بھی دی تاکہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ ان سے بغض رکھتا ہے ۔۔ یہی علماء حق کا طریقہ کار ہے ۔۔ شیخ کی دعا یہ ہے "اللهم اجعل هذه الاخطاء بردا وسلاما عليهم في قبورهم يا رب العالمين. اللهم تجاوزها عنهم يا ذا الجلال والاكرام. واعلن نزلهم وافتح لهم ابواب الفردوس الاعلى يا ذا الجلال والاكرام--- اے اللہ! ان غلطیوں کو ان کے لیے قبروں میں آرام اور سلامتی بنادے، اے رب العالمین۔ اے جلال اور اکرام والے! ان پر اسے معاف فرما۔ ان کے مقام کو بلند فرما اور ان کے لیے جنت الفردوس کے دروازے کھول دے، اے جلال اور اکرام والے۔ مترجم)

جبکہ جمہور (المالكية والشافعية والحنابلة) نے اس کو رد کر دیا اور کہا: یہ نسخ نہیں، بلکہ بیان اور تفصیل ہے۔لہٰذا ایسی تمام قواعد جو سنت یا قرآن کے خلاف نتیجہ دیں، وہ باطل اور مردود ہیں، چاہے انہیں کسی بڑے امام نے کہا ہو۔

ان کے اس قول کا کیا مطلب ہے کہ "نص پر زیادتی کرنا نسخ ہے یا نسخ نہیں ہے؟"

جان لو کہ جب ہم اس قاعدے میں "زیادتی" کہتے ہیں تو اس سے مراد سنت ہے، اور جب "نص" کہتے ہیں تو اس سے مراد قرآن ہے۔

خلاصہ قاعدہ یہ ہے کہ: اگر قرآن نے کوئی حکم بیان کیا، پھر سنت آئی اور اس میں کوئی قید یا شرط کا اضافہ کردیا، تو یہ کہلاتا ہے "نص پر زیادتی"، یعنی سنت نے قرآن کے حکم پر اضافہ کردیا۔

احناف ایسی سنت کو قبول نہیں کرتے جو نص پر کوئی اضافہ کرے۔ وہ کہتے ہیں: کیوں؟

اس لیے کہ قرآن کا حکم تو اپنے اندر مکمل اور مستقل تھا، پھر سنت آئی اور اس کی آزادی اور استقلال کو ایک نئے قید کے ساتھ بدل دیا۔ اور یہ گویا نسخ ہے۔ اور سنت قرآن کو منسوخ نہیں کرسکتی۔

ہم نے کہا: اے احناف! یہ نسخ نہیں ہے بلکہ اضافہ ہے۔

انہوں نے کہا: نہیں، یہ قرآن کے حکم کی آزادی کو ختم کرنا ہے۔

کیا ایسا نہیں تھا کہ اضافہ ہونے سے پہلے قرآن کا حکم اپنے طور پر مکمل اور آزاد تھا؟ پھر جب سنت نے شرط کا اضافہ کردیا تو اب قرآن کا حکم اپنے طور پر آزاد نہ رہا بلکہ سنت کے ساتھ مقید ہوگیا۔

تو اب سوال یہ ہے: کیا سنت قرآن کو منسوخ کرتی ہے؟

وہ کہتے ہیں: نہیں، سنت قرآن کو منسوخ نہیں کرتی۔

پھر حل کیا ہے؟

کہتے ہیں: سنت کو رد کر دو۔

سنت کو قرآن کے حکم پر رد کرنا—کیا یہ صحیح ہے؟ اللہ کی قسم! یہ صحیح نہیں ہے۔

اور احناف "زیادتی" سے یہ مراد نہیں لیتے کہ سنت ایسا کوئی بالکل نیا اور مستقل حکم لے آئے جو قرآن میں ذکر ہی نہ ہو۔ نہیں! ایسی زیادتی کو احناف قبول کرتے ہیں۔ لیکن ان کی مشکل کہاں ہے؟ وہ یہ کہ اگر کوئی حکم قرآن میں ذکر ہو، اور سنت اسی پر کوئی چیز مزید بڑھا دے، تو وہاں وہ اشکال کرتے ہیں۔

لیکن اگر سنت ایک بالکل نیا اور مستقل حکم لے آئے، جیسے: "ہر کچلی والے درندے اور ہر پنجہ والے پرندے کا کھانا حرام ہے" ۔ تو ایسی "استقلالی زیادتی" سب کے نزدیک مقبول ہے۔اور میں تمہیں ایک مثال یا دو مثالیں دے کر واضح کرتا ہوں۔

الحمدللہ، والصلوۃ والسلام علی رسول اللہ—

مثال نمبر 1: صحیحین میں عبادہ رضی اللہ عنہ سے حدیث ثابت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:" جس نے سورۃ فاتحہ نہیں پڑھی اس کی نماز نہیں ہوئی۔" یہ حدیث کہاں ثابت ہے اے شیخ فہد؟ صحیحین میں۔لیکن حنفیہ اس پر عمل نہیں کرتے۔ وہ

کہتے ہیں: سورۃ فاتحہ پڑھنا نماز کے ارکان میں سے نہیں بلکہ سنن میں سے ہے، نہ ہی یہ واجب ہے۔

ہم نے پوچھا: کیوں؟

انہوں نے کہا: کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا: "پس قرآن میں سے جو میسر ہو وہ پڑھو۔"

تو کیا قرآن نے سورۃ فاتحہ کو خاص کیا؟ نہیں۔

یہ تخصیص کہاں آئی؟ سنت میں۔

تو سنت نے قرآن کے عام پر ایک خاص اضافہ کیا۔

اب ان کے اصول کے مطابق یہ اضافہ نسخ ہے اور سنت قرآن کو منسوخ نہیں کر سکتی۔لہٰذا وہ حدیثِ عبادہ کو رد کرتے ہیں۔ یعنی ان کے اصول نے ان پر لازم کر دیا کہ وہ صحیح سنت کو چھوڑ دیں۔ دیکھا تم نے! کیسے باطل اصول باطل نتائج پیدا کرتے ہیں؟

اس لیے اے طالب علم! ہمیشہ یہ دیکھو کہ کوئی بھی قاعدہ یا اصل اپنانے سے پہلے اس کو نصوص اور سلف کے کلام پر پیش کرو۔ اگر وہ اس کے مطابق ہو تو اس کو اختیار کرو، کیونکہ بعد میں تمہارے اجتہادات انہی اصولوں پر بنیں گے۔ اگر اصول صحیح ہیں تو نتائج بھی صحیح ہوں گے۔ اور اگر اصول باطل ہیں تو نتائج بھی باطل ہوں گے۔

مثال نمبر 2: حنفیہ کیوں تکبیر تحریمہ میں "اللہ اکبر" کو لازم نہیں سمجھتے؟

حالانکہ صحیح حدیث میں یہ موجود ہے۔

صحیحین میں ابوہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"جب نماز کے لیے کھڑا ہو تو اچھی طرح وضو کرو، قبلہ رخ ہو جاؤ اور تکبیر کہو۔"

اور ایک روایت میں ہے: "اللہ اکبر کہو۔"سنن ابی داؤد میں بھی صحیح سند سے وائل بن حجر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب نماز شروع کی تو قبلہ رخ ہو کر ہاتھ اٹھاتے اور "اللہ اکبر" کہتے۔ لیکن حنفیہ کہتے ہیں: بندہ نماز میں کسی

بھی ذکر و تعظیم کے ساتھ داخل ہو سکتا ہے، جیسے "لا الہ الا اللہ" کہہ دے تو بھی داخل ہوگیا۔

کیوں؟

کیونکہ ان کے اصول کے مطابق قرآن میں آیا: ﴿فَذَكَرَ ٱسْمَ رَبِّهِۦ فَصَلَّىٰ﴾ "اس نے اپنے رب کا ذکر کیا اور نماز پڑھی۔"-- یہاں اللہ نے "ذکر" کہا، "تکبیر" نہیں کہا۔لہٰذا ان کے اصول کے مطابق مخصوص حدیث کو قبول نہیں کیا گیا، اس لیے کہ یہ قرآن پر اضافہ ہے اور سنت قرآن پر اضافہ نہیں کر سکتی۔

پس بندہ جب اللہ کا نام لیتا ہے (نماز میں داخل ہوتا ہے)۔ تو سنت نے اس کو معین کر دیا۔ حنفیہ نے کہا: نہیں، اگر ہم سنت کی ان احادیث کو قبول کرلیں جو معین کرتی ہیں، تو یہ قرآن پر زیادتی ہے۔ اور قرآن پر زیادتی نسخ ہے، اور سنت قرآن کو منسوخ نہیں کرتی۔ (یا-- لا إله إلا الله!)دیکھو علما نے کیا کچھ نہیں کہا۔

جمہور (مالکی،شافعی،حنبلی) کہتے ہیں: ہم سنت کی زیادتی کو قبول کرتے ہیں، خواہ وہ استقلالی ہو یا غیر استقلالی۔ اور غیر استقلالی زیادتی کو ہم "زیادتی بیانی" کہتے ہیں، جو نسخ نہیں ہے بلکہ قرآن کی وضاحت ہے۔ سنت نے قرآن کے مجمل کی تفصیل بیان کی ہے۔

(شیخ طلبہ سے کہہ رہے ہیں:) میری بات غور سے سنو، اِدھر اُدھر نہ دیکھو۔ مجھے کسی کی توجہ بٹتی ہوئی پسند نہیں۔ جیسے ہی کوئی اندر آتا ہے تو تم سب اس کی طرف دیکھنے لگتے ہو۔ آخر کیوں؟ آخر تمہارا دھیان کیوں بٹتا ہے؟ میری طرف متوجہ رہو۔ دیکھو یہ اصولی مسائل بہت اہم ہیں، واللہ! ہم ابھی تمہارے اندر علم کی بنیاد ڈال رہے ہیں، جس سے تم بڑے ہوکر بہت فائدہ اٹھاؤ گے۔)

اور تم سمجھو گے کہ علما نے فلاں حدیث کیوں رد کی؟ کیونکہ اس نے اس کو ایک قاعدے پر بنیاد دی۔ اور فلاں عالم نے حدیث کیوں قبول کی؟ کیونکہ اس نے اسے ایک اصول پر بنیاد دی۔ تو اے طالب علم! یہ کوشش کرو کہ تمہارے سیکھے گئے قواعد تمہیں حدیث قبول کرنے پر آمادہ کریں، حدیث رد کرنے پر نہیں۔

کیا تم نے جانا کہ حنفیہ لفظ "اللہ أکبر" کو کیوں متعین نہیں کرتے (نماز کے تکبیر میں)؟ کیونکہ اگر وہ اس قاعدے کو قبول کرلیں تو ان پر لازم آجائے گا کہ وہ سنت کی کئی باتوں کو رد کریں۔ اس موضوع پر ایک کتاب ہے تحریر القواعد و مجمع الفرائض جس میں یہ باطل اصولوں کی تردید کی گئی ہے۔

یہ باطل اصول ہیں۔ کیونکہ ان پر عمل کرنا شریعت کے دلائل کے بعض حصوں کو رد کرنا لازم کرتا ہے۔ اور یہ ہمارے لیے واجب ہے کہ ہم ان کو رد کریں۔ اے استاد ہارون! یہ صرف ائمہ تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ صحابہ کے اقوال اور مذاہب پر بھی لاگو ہوتے ہیں۔

یعنی یہ قاعدہ صرف ائمہ کے لیے خاص نہیں ہے بلکہ یہ صحابہ کے اقوال تک آتا ہے۔ اور ہم کہتے ہیں: صحابی کا قول حجت ہے، لیکن شرط کے ساتھ اگر تم علما کی شرط کو دیکھو تو پاؤ گے کہ ان میں سب سے پہلی شرط یہی ہے کہ اس کا قول نص کے مخالف نہ ہو۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا، اے پیارے بھائیو! اور دوسری باطل قواعد میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے جو بعض فقہا نے بیان کیا ہے۔ اور میں نہیں چاہتا کہ اسے کسی خاص مذہب کی طرف منسوب کروں تاکہ ان کے ماننے والوں کو برا نہ لگے۔

وہ قاعدہ یہ ہے: "جب خبر واحد ، اصل(یعنی فقہی اصول) کے خلاف ہو تو اصل مقدم ہوگا"۔ یہ بڑی عجیب بات ہے! کہ خبر واحد جب بھی اصل کے خلاف ہو تو اصل کو ترجیح دی جائے گی۔ تو کہتے ہیں: خبر واحد اگر اصول کے خلاف ہو تو مردود ہے۔

اور یہ قول خود مردود اور باطل ہے۔ کسی کو بھی یہ اختیار نہیں کہ اس قاعدے کو قبول کرے یا اس پر عمل کرے۔ چاہے اسے کوئی بڑا کہے یا چھوٹا۔ کوئی بھی حدیث اگر صحیح ہے تو اسے اس بے بنیاد دلیل کی وجہ سے رد کرنا جائز نہیں۔

بلکہ ہم تو اس "اصل"یعنی فہی اصول کو بھی قبول نہیں کرتے اگر وہ دلائل کے خلاف ہو۔ کوئی طالب علم یا عالم کیونکر خوش ہو سکتا ہے کہ وہ ایک اصل قائم کرے اور اسے "اصل" مانے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ یہ دلائل کے خلاف ہے؟ یہ اصل نہیں ہے، یہ شیطان ہے۔ یہ اصل نہیں ہے بلکہ حدیث کے خلاف ایک فاسد اصول ہے۔

(احناف سے سوال)تو دلیل کیا ہے کہ اسے اصل بنایا جائے؟ (ج) کوئی دلیل نہیں!

لہٰذا ایسے اصول قائم کرنا درست نہیں جو سنت کے مخالف ہوں۔ اصل تو وہی ہے جو کتاب و سنت کے موافق ہو اور انہی سے نکلا ہو۔

پس جو کچھ رسول الله ﷺ سے صحیح ثابت ہوا، وہی اصل ہے۔ وہی اصل ہے جس کی مخالفت جائز نہیں۔ اس کی معارضت جائز نہیں۔ اس پر تقدّم جائز نہیں۔

ہم الله تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ائمہ پر رحم فرمائے۔ اور انہی فروعات کو ختم کرتے ہیں ایک اور فرع کے ساتھ جو بعض فقہا نے کہا ہے (اور ہم نہیں چاہتے اسے بھی کسی خاص مذہب کی طرف منسوب کریں)۔

انہوں نے کہا: "ہر وہ نص جو ہمارے امام کے مذہب کے خلاف ہو، یا تو اس کی تاویل کی جائے گی یا اسے منسوخ مانا جائے گا۔" یعنی ہر وہ دلیل جو ہمارے امام کے قول کے خلاف ہو، اصل یہ ہے کہ وہ یا تو مؤول ہے یا منسوخ۔(اصولی کرخی)

یہ اصول درست ہے یا فاسد؟ أعوذ بالله! یہ فاسد ترین اصولوں میں سے ایک ہے جو میں نے سنا ہے۔ فقہ اسلامی اور اصولِ فقہ میں یہ سب سے زیادہ باطل اور خراب اصول ہے۔ کیونکہ اصل یہ ہے کہ مذہب دلیل کے تابع ہو، نہ کہ دلیل مذہب کے تابع ہو۔ اصل دلیل ہے، مذہب فرع ہے۔ اور فرع اپنے اصل کے تابع ہوتی ہے۔ دلیل آقا ہے، مذہب تابع ہے۔ اور تابع اپنے آقا سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

پس یہ بات کہاں ہے اور انصاف کہاں؟ أعوذ بالله! یہ تعصب ہے اور تعصب اپنے پیروکاروں کو کیا کچھ نہیں کرواتا!

مقصود یہ ہے کہ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ کسی بھی قاعدے کو نص کے خلاف قائم کرنا جائز نہیں۔ اور نہ ہی کسی اصل کو نص کے خلاف بنیاد بنانا جائز ہے۔ جب بھی تم دیکھو کہ تمہارا قائم کیا ہوا قاعدہ یا اصل ایسا ہے جس کے نتیجے میں کسی دلیل کو رد کرنا لازم آ رہا ہے، تو فوراً اپنی بنیاد کو درست کرو۔ اسے صحیح رخ پر لاؤ۔ صحیح دلائل کو رد کرنا جائز نہیں صرف اس لیے کہ وہ کسی امام کا اصل یا کسی شیخ کا ضابطہ یا تمہارے علاقے کے اہلِ مذہب کا قول ہے۔ یہ سب اس وقت تک قابل قبول نہیں جب تک نصوص ان کی تائید نہ کریں۔ اور جب بھی یہ نصوص کے مخالف ہوں، انہیں ترک کرنا واجب ہے۔

والله أعلم۔

تیسرا درس

فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا (النساء: 59)

تو اگر تم کسی بات میں اختلاف کرو تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو، اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ بہتر اور بہترین انجام ہے۔ میں نے اس شرعی معنی کو نص کے الفاظ میں بیان کرنے کو ترجیح دی۔ کیوں؟ کیونکہ شرعی معانی کو نصوص کے الفاظ میں بیان کرنا زیادہ مناسب ہے۔ اس سے یہ قاعدہ ایک ہی وقت میں اصول اور دلیل دونوں بن جاتا ہے۔ جو اس قاعدے پر عمل کرے، وہ ادلّہ کو حق قدر سمجھتا ہے۔اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾

اور اسی طرح: ﴿وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ﴾

اور اسی طرح:﴿وَأَنْ يَحْكُمَ بَيْنَهُم بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ﴾

علماء نے اتفاق کیا ہے کہ متنازع امور کو کتاب اور سنت کی طرف لوٹانا واجب ہے۔ علماء نے اتفاق کیا کہ "رد کرنے کا مطلب اللہ کی طرف ہے" یعنی کتاب کی طرف، اور "رد رسول کی طرف" کا مطلب ہے زندگی میں ان کی طرف رجوع اور ان کے انتقال کے بعد سنت کی طرف رجوع۔

پس یہ قاعدہ یہ کہتا ہے کہ جو بھی اختلاف علماء کے درمیان ہو، اس کا حل صرف کتاب اور سنت سے لیا جائے۔ کیوں؟ کیونکہ کتاب اور سنت کی اطاعت لازمی اور بلا شرط ہے۔ اور کسی بھی قول کو متنازع امور کی طرف رجوع کے لیے قبول نہیں کیا جا سکتا، جب تک کہ وہ بلا شرط اطاعت کے قابل نہ ہو۔ لہٰذا، کسی امام، عالم، مذہب، انسانی رائے، عقل، حاکم یا دیگر امور کی طرف اختلاف کو رجوع نہیں کیا جا سکتا۔ متنازع امور کی رجوع صرف کتاب اور سنت کی طرف ہو گی۔

تو جب کہیں اختلاف ہو، جیسے کہ فرمایا: "فإن تنازعتم في شيء"، یہ شرط کے طور پر آیا ہے۔ یہاں "شيء" کا مطلب کسی شے سے ہے، اور "تنازعتم" شرط ہے۔ اس میں اختلاف دینی اور دنیاوی دونوں امور میں شامل ہے۔ اختلاف کا حل ہمیشہ اللہ کے کتاب اور نبی کی سنت کے مطابق ہوگا، اور وہ ہدایت کے لیے کافی ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ﴾

"اور *الکتاب* سے مراد قرآن ہے، ایک تفسیر کے مطابق۔"، قران و سنت ایک دوسرے سے متصادم نہیں۔ اصول میں یہ طے ہے کہ اگر لفظ کے متعدد معنی ہوں تو وہ سب پر اترتا ہے۔ اس لیے ہر وہ معاملہ جس کی ضرورت انسان کو دنیا یا دین میں ہو، کتاب و سنت میں اس کا ذکر موجود ہے، چاہے وہ صریح بیان ہو یا مفہوم یا ضمنی آثار۔

مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو اہل علم سے رجوع کرنا چاہیے، جو دلائل سے واقف ہیں اور استدلال کے مواقع جانتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو دین کے امین ہیں۔ اور جو یہ عقیدہ رکھے کہ دلائل (یعنی قرآن و سنت) زمانے کے نئے نئے واقعات کی ضروریات کو پورا نہیں کرتے، تو وہ اہلِ بدعت میں سے ہے۔

اور یہ مسئلہ ۔ یعنی یہ گمان کہ دلائل زمانے کے نئے واقعات کے لیے کافی نہیں ۔ اس وقت داخل ہوا جب اصولِ فقہ میں تصنیف و تالیف کی باگ ڈور اہلِ کلام کے ہاتھ میں آگئی، جو قرآن و سنت میں غور و فکر ہی نہیں کرتے تھے۔ ورنہ سلف اس بات پر متفق تھے کہ قرآن و سنت میں استدلال کے پہلو اور دلائل ایسے موجود ہیں جو لوگوں کی تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کافی ہیں، خواہ ان کے سامنے کیسے ہی نئے مسائل آئیں یا مختلف قسم کے حالات پیش ہوں۔ چاہے وہ تمام نئے بینکوں کے معاملات ہوں، یا نئی کاروں کے لین دین کے مسائل، یا زمینوں اور جائیدادوں کے نئے مسائل، یا ریاستوں کے درمیان سیاسی تعلقات کے مسائل ہوں یا کوئی اور صورت۔ یہ سب قرآن میں کسی نہ کسی اصل کے تحت ضرور موجود ہیں۔

لیکن یہ سمجھ بوجھ اللہ تعالیٰ اپنے جس بندے کو چاہے عطا فرماتا ہے، اور یہی وہ مقام ہے جہاں علماء دوسروں سے ممتاز ہوجاتے ہیں۔ بلکہ جو علم اصول پر مضبوط بنیادوں کے ساتھ حاصل کرے، وہ بھی ممتاز ہوتا ہے۔ کیونکہ کوئی بھی نیا جزوی مسئلہ (نازلہ) لازمی طور پر قرآن کے کسی نہ کسی اصل کے تحت داخل ہوتا ہے۔لہٰذا، جو لوگ کہیں کہ موجودہ دور کے مسائل کے لیے دلائل کافی نہیں ہیں، وہ بدعتی اور نامقبول ہیں۔ متنازع امور کی رجوع کسی مکتب، انسانی رائے، عقل یا فاسد اجتہاد کی طرف نہیں ہوتی، بلکہ صرف کتاب و سنت کی طرف رجوع ہوتی ہے۔ اختلاف کا فیصلہ دلائل سے کیا جاتا ہے۔میں یہ بات بار بار کہہ رہا ہوں تاکہ یہ قاعدہ ذہن میں مضبوط ہو جائے۔

"اور ہمیشہ اگر تم کسی کے دل میں کوئی بات بٹھانا چاہو تو اسے بار بار اس کے کانوں میں دہراتے رہو، چاہے وہ جھوٹ ہی کیوں نہ ہو۔ کثرتِ تکرار کے بعد وہ اسے سچ سمجھنے لگے گا۔"

پس اختلاف کا فیصلہ کسی فرد عالم، کسی علمی جماعت یا فقہی مجلس کی رائے سے نہیں ہوتا، بلکہ ہمیشہ کتاب و سنت سے ہوتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اختلاف کی صورت میں براہ راست کتاب و سنت کی طرف رجوع کرتے تھے۔ جب انہیں کسی مسئلے پر دلیل معلوم ہو جاتی، تو اس کے مطابق عمل کرتے اور اس کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کرتے۔ نہ اس سے انکار کرتے، نہ ٹال مٹول کرتے، نہ اپنی رائے کے مطابق فیصلہ کرتے۔

إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ ٱلْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوٓاْ إِلَى ٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَن يَقُولُواْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۚ
"مؤمنوں کا قول تو یہی ہوتا ہے کہ جب انہیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جائے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے، تو وہ کہتے ہیں: ہم نے سنا اور اطاعت کی۔ اور جو لوگ نص کے مخالفت کرتے ہیں، جب حدیث یا آیت سنی جاتی ہے، تو سوال کرتے: "کیا یہ حکم ہے یا نہی؟" یہ نص کی مخالفت ہے۔ واجب یہ ہے کہ کہا جائے: "سمعنا وأطعنا"، یعنی سبقت دی جائے سماعت اور اطاعت میں۔

اور اگر تم ہمارے زمانے کے لوگوں کو دیکھو تو (تم پاؤ گے کہ) جب وہ سوال کرتے ہیں: "کیا یہ حکم وجوب کا ہے یا نہی (حرمت) کا؟" تو یہ اس لیے نہیں ہوتا کہ وہ اس کی حقیقت اور درجے کو جاننا چاہتے ہیں، بلکہ اس لیے ہوتا ہے کہ اس سے بچ نکلنے کا راستہ ڈھونڈ سکیں۔

پھر اگر وہ حکم وجوب کا نہ ہو تو کہتے ہیں: "الحمدللہ، یہ تو واجب نہیں ہے۔"

اور جب تم انہیں کوئی نص (دلیل) بیان کرو جو کسی چیز کو حرام قرار دیتی ہو، تو ہمارے زمانے کے لوگ ۔ اللہ ہی ان پر مددگار ہو ۔ اگر ان کے درمیان اختلاف ہوجائے اور کوئی دلیل ایک مذہب کو دوسرے مذہب پر راجح قرار دے، تو تم دیکھو گے کہ وہ دلائل کی گردنیں مروڑنے لگتے ہیں، یہاں تک کہ وہ دلائل ان کے مذہب کے موافق ہو جائیں، چاہے اس کے لیے ان کی اصل دلالت کو قربان ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ پھر اگر دلیل واضح ہو جائے اور ان پر قائم ہو جائے، تو کہتے ہیں: "یعنی یہ آخری دلیل ہے نا؟" وہ ایسا تب کہتے ہیں جب ان کے پاس حجتیں ختم ہو جاتی ہیں۔

اور وہ یہ بھی کہتے ہیں: "اگر تمہاری دلیل سچی ہوتی تو فلاں بڑے عالم نے اس کو ضرور کہا ہوتا۔" اور ہم سے بھی اکثر کہا گیا: "اگر تمہاری بات یا تمہاری دلیل حق ہوتی تو فلاں بڑے عالم نے اس پر عمل ضرور کیا ہوتا۔ کیا تم فلاں سے زیادہ جانتے ہو؟ اچھا، اب تم ایک دلیل لے کر آئے ہو!!!

(شیخ) : تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ فلاں (عالم) معصوم ہے؟ یا یہ عقیدہ رکھتے ہو کہ وہ سنت کے سارے علم کا احاطہ کیے ہوئے ہے؟

یہی حال ہمارے زمانے کے لوگوں کا ہے۔ یہ دراصل اس شخص کی بات ہے جس نے دلائل کی تعظیم نہیں کی اور نہ انہیں ان کے شایانِ شان مقام دیا۔ اور وہ یہی چاہتا ہے کہ دلائل اس کے امام کے مذہب کے تابع رہیں۔

بلکہ اگر تم انہیں وہ دلائل سنا دو جو ان کے اقوال اور ان کی خواہشات کے خلاف ہوں، تو ان کے چہرے بجھ جاتے ہیں اور ان کی پیشانیوں پر دلیل سے نفرت اور کراہت صاف پہچانی جاتی ہے۔یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے تحت آجاتے ہیں:

﴿وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ تَعْرِفُ فِي وُجُوهِ الَّذِينَ كَفَرُوا الْمُنكَرَ﴾

"اور جب ان پر ہماری واضح آیات پڑھی جاتی ہیں، تو تم ان کافروں کے چہروں پر انکار و بیزاری کے آثار پہچان لیتے ہو۔"

سب ایسے نہیں ہیں کہ وہ کافر ہوں، لیکن یہ آیت جس کیفیت کا ذکر کرتی ہے، اسی طرح وہ دلیل کا استقبال کرتے ہیں۔ جب دلیل ان کے سامنے پیش کی جائے جس کے خلاف ان کا مذہب ہو، تو ان کے چہرے پر بیزاری چھا جاتی ہے۔

اور تم اس کیفیت کو ان کے نقوش اور تاثرات میں پہچان لو گے۔ چنانچہ جب بھی تم ان کے سامنے کوئی ایسی دلیل پیش کرو جو ان کے مذہب کے خلاف ہو، تم دیکھو گے کہ ان کا چہرہ بگڑ جاتا ہے، وہ غصے میں آجاتے ہیں، ان کی آواز سخت اور بلند ہوجاتی ہے، گویا تم ان کے پاس کوئی بم یا بارودی سرنگ لے آئے ہو جس سے وہ بھاگنا چاہتے ہیں۔ بلکہ اس قاعدے کے تحت یہ بات بھی آتی ہے کہ اگر دلیل ظاہر کرنے سے کسی کے قول کی مخالفت لازم آتی ہو تو وہ دلیل کو چھپا لیتا ہے۔ چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ وہ شخص (العیاذ باللہ) دلائل میں تحقیق کرتا ہے اور ان دلائل تک پہنچ بھی جاتا ہے جو اس کے امام کے قول کے خلاف ہوتے ہیں، لیکن وہ اس دلیل کو لپیٹ دیتا ہے اور اپنے اختلاف میں ذکر نہیں کرتا۔ کیونکہ

اگر وہ اس کو ظاہر کرے تو اس کا اپنا قول یا اس کے امام کا قول رسوا ہوجائے گا۔ اس لیے نہ وہ خود اسے ظاہر کرنا چاہتا ہے اور نہ چاہتا ہے کہ کوئی اور اسے ظاہر کرے۔

کیا یہ عمل دلائل کی تعظیم کرنے والے کا ہے؟
نہیں، اللہ کی قسم! یہ کبھی بھی اس شخص کا عمل نہیں ہوسکتا جو دلائل کی عظمت دل میں رکھتا ہو۔ کیونکہ جس کے دل میں دلائل کی تعظیم ہو وہ ہرگز یہ پسند نہیں کرے گا کہ کوئی دلیل اس کے امام کے مذہب کے خلاف آجائے اور پھر وہ اسے چھپائے یا اس پر افسوس کرے اور اعتراض جتائے۔

بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت اور خطرناک بات یہ ہے کہ اگر تم کسی چیز کو صحیح دلیل سے حرام قرار دو، تو تم ایسے لوگوں کو پاؤ گے جو یہ کہتے ہیں: "اگر یہ حرام ہوتا تو حکومت اسے کیوں منظور کرتی؟"

یوں وہ دلیل کو رد کر دیتے ہیں، اسناد کو رد کر دیتے ہیں، اور علماء کے اقوال کو بھی رد کر دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک دلیل کا وزن ہی نہیں رہتا، کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ واقعی حرام ہوتا تو حکومت اسے منظور ہی نہ کرتی۔

تو کیا یہ مخالفت صحیح ہے؟
کیا یہ اس شخص کی بات ہے جس نے دلیل کی تعظیم کی ہو؟
جواب ہے: نہیں، اللہ کی قسم! یہ ہرگز اس شخص کی بات نہیں جس نے دلیل کی عظمت کو سمجھا اور اس کا حق ادا کیا ہو۔

چنانچہ وہ حق اور باطل کے فیصلے کا مدار ریاست کے نظام یا قانون کو قرار دیتے ہیں۔ اور یہ بات، اللہ کی قسم، بہت ہی خطرناک ہے۔ ہمیں ڈر ہے کہ کہیں اس پر وہ حدیث صادق نہ آ جائے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی:

"کیا وہ تمہارے لیے اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال نہیں کرتے اور تم اسے حلال کر لیتے ہو؟ اور کیا وہ تمہارے لیے اللہ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام نہیں کرتے اور تم اسے حرام کر لیتے ہو؟"اس پر صحابی نے کہا: کیوں نہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہی تو ان کی عبادت ہے۔" یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی تفسیر ہے: ﴿اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِن دُونِ اللَّهِ﴾

لہٰذا ہمیں ایک پکا عقیدہ رکھنا چاہیے، اے بھائیو! کہ حق و باطل، مردود و مقبول کے فیصلے کا اصل معیار صرف اور صرف کتاب و سنت ہے۔ اور چاہے ساری

دنیا اس حق کو رد کر دے، اگر وہ دلیل اپنے سند اور دلالت کے اعتبار سے صحیح ہے تو وہی حق ہے اور ساری دنیا باطل پر ہے۔ دلیل ہی حق ہے، چاہے سب لوگ گمراہی میں ہوں۔ مگر الحمد لله، امت کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوگی۔ پس فیصلہ نہ عقل پر ہے، نہ آراء پر، نہ اس پر جو نظام نے منظور کیا، نہ اس پر جو ریاست نے منظور کیا، نہ بین الاقوامی رواج اور قوانین پر۔ بلکہ حق وہی ہے جو کتاب و سنت نے مقرر کیا ہے، چاہے دنیا کے سب لوگ اسے رد کر دیں۔ اور باطل وہی ہے جسے کتاب و سنت نے باطل کہا ہے، چاہے دنیا کے سب لوگ اسے منظور کر لیں۔ کیا ہم اس سوچ کے ساتھ جی سکتے ہیں؟ ان شاء اللہ۔

اسی لیے ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا مطلب سمجھتے ہیں: "اسلام اجنبی طور پر شروع ہوا اور اسی طرح اجنبی ہو جائے گا جیسے شروع ہوا تھا۔" کیونکہ اگر آپ دنیا کے ساتھ متفق نہ ہوئے تو آپ خود کو تنہا پائیں گے۔ ایسے لوگوں کے درمیان جو آپ کے دین پر نہیں ہیں، جن کے رجحانات آپ جیسے نہیں، جن کے اصول آپ جیسے نہیں، جن کے دلائل کے طریقے آپ جیسے نہیں، جن کے نظام آپ جیسے نہیں۔ آپ اپنے دل میں یہ دیکھتے ہیں کہ وہ باطل پر ہیں۔ تو آپ کو اجنبی محسوس ہوتا ہے۔ یہ اجنبیت ظاہر کی نہیں بلکہ باطن کی اجنبیت ہے، عقیدے کی اجنبیت ہے۔ آپ لوگوں کے درمیان رہتے ہیں، اپنے گھر والوں کے ساتھ ہیں، بیوی بچوں کے درمیان ہیں، لیکن دل میں اجنبیت محسوس کرتے ہیں۔

یہی ہے وہ دین جس پر اللہ نے اپنے بندوں کو قائم کیا ہے۔ اور یاد کرو کہ ہم کچھ دینی بھائیوں (یعنی اسلام میں بھائی، نہ کہ سیاسی معنی میں اخوان المسلمین) کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے۔ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی میلاد کے جشن کے مسئلے پر بحث کر رہے تھے۔ جب ان کی دلیل ختم ہو گئی اور ہم نے اسے اصولوں اور قواعد کی بنیاد پر توڑ دیا، تو اس نے کہا: "اگر یہ حرام ہوتا تو بڑے بڑے علماء اسے نہ مناتے، اور ریاست اسے منظور نہ کرتی۔" دیکھو یہ کس طرح کی دلیل ہے! ان کی آخری دلیل یہی ہوتی ہے: "اگر یہ حرام ہوتا تو فلاں فلاں عالم وہاں موجود نہ ہوتا، اور فلاں ریاست اسے منظور نہ کرتی۔"

پھر کہا جاتا ہے: "کیا تم زمین پر اکیلے حق پر ہو اور یہ سب، یعنی عامۃ المسلمین، سب کے سب باطل پر ہیں؟" یہ بات آپ بہت سنیں گے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ میلاد کا حق یا باطل ہونا اس سے معلوم نہیں ہوتا کہ کسی عالم نے اسے مانا یا نہیں، یا کسی نے اس میں شرکت کی یا نہیں۔ بلکہ فیصلہ صرف کتاب و سنت اور سلف صالحین کی روش سے ہوتا ہے۔ اگر دلائل کے مطابق یہ باطل ہے تو یہ باطل

ہے، چاہے ہزار علماء اس میں شریک ہوں۔ اور اگر حق ہے تو حق ہے، چاہے کوئی بھی اس میں شریک نہ ہو۔ پس فیصلہ نہ کثرت و قلت سے ہوتا ہے اور نہ ہی یہ کوئی معیار ہے۔ بلکہ معیار کتاب و سنت ہے۔اس سے خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ متنازع امور کو لوٹانا صرف کتاب و سنت کی طرف واجب ہے۔ یہی وہ دین ہے جس پر اللہ نے اپنے بندوں کو قائم کیا ہے، اور یہ بہت بڑی اصولی قاعدہ ہے۔

قاعدہ نمبر سات: «لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى يَكُونَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهِ»

"تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک اس کی خواہش میرے لائے ہوئے دین کے تابع نہ ہو۔"(الاربعون للنوی)

یہ قاعدہ تعظیمِ دلیل کے سب سے عظیم قواعد میں سے ہے۔ کیا ہی زبردست قاعدہ ہے، کیا ہی اعلیٰ اصول ہے! یہی اصل پیمانہ اور معیار ہے کہ کون اللہ کی رضا کو مقدم رکھتا ہے اور کون اپنی خواہشات و شہوات کو۔

تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہوگا جب تک اس کی خواہش حق کے تابع نہ ہو، نہ کہ خواہش کے تابع۔ اس قاعدے کی اصل ایک حدیث ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی گئی ہے۔ اس حدیث کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، بعض نے اسے صحیح کہا ہے، بعض نے حسن کہا ہے اور بعض نے ضعیف قرار دیا ہے۔ لیکن ہم نے اسے صرف ایک قاعدے کے طور پر ذکر کیا ہے جو تعظیمِ ادلہ کے باب میں آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دلائل کی مخالفت کی سب سے بڑی وجہ کیا ہے؟ سب سے بڑی وجہ خواہشات کی پیروی ہے یعنی محبت اور جھکاؤ۔

کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جو حدیث کو اس لیے رد کردیتے ہیں کہ ان کے پاس کوئی حجت یا دلیل نہیں ہوتی، بلکہ صرف اپنی خواہش کی وجہ سے۔ وہ اپنی خواہش کی بنا پر فلاں قول کو دوسرے قول پر ترجیح دیتے ہیں، نتیجہ یہ کہ حدیث کو چھوڑ دیتے ہیں یا پھر اس کی ایسی تاویل کرتے ہیں جو ان کی خواہشات سے میل کھا سکے۔ پس ہمارے لیے درست ہے کہ ہم اس کو اصولِ تعظیمِ دلیل میں سے ایک قاعدہ مانیں، کیونکہ جو بھی حق کو چھوڑتا ہے وہ دراصل اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے۔ اور حق کو چھوڑنے کے پیچھے صرف اور صرف خواہش کی پیروی ہے۔

پس اے ابنِ آدم! تم دو ہی حالتوں کے درمیان گھوم رہے ہو: یا تو تم حق کے پیروکار ہو یا خواہش کے۔ اس کے درمیان کوئی تیسرا درجہ موجود نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَى﴾

(اے داؤد! ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا ہے، پس لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو اور خواہش کی پیروی نہ کرو۔)

یعنی یا تو حق کے ساتھ فیصلہ کرو گے یا خواہش کی پیروی کرو گے۔ کوئی تیسرا درجہ نہیں۔ جو حق کو چھوڑ دے گا وہ خواہش کی پیروی میں گرا، اور جس نے خواہش کو چھوڑ دیا وہ حق کے ساتھ فیصلہ کرنے والا بنا۔

اب تھوڑی دیر میں اس پر مزید دلائل آئیں گے، لیکن میں نے وضاحت کی خاطر اسے پہلے ہی ذکر کردیا ہے۔ پس جب بھی کتاب و سنت میں خواہش کی پیروی کو حرام کہا گیا ہے تو یہ اس قاعدے پر ہی دلیل ہے۔ مشرکین نے رسولوں کی پیروی کیوں نہ کی؟ اپنی خواہشات کی وجہ سے۔ اور ان میں سب سے بڑی خواہش اپنے آباء و اجداد کی تعظیم تھی۔ اور تعظیم بھی خواہش کی ایک قسم ہے، یعنی اسلاف و آبا کی حالت سے محبت۔ بلکہ آج بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو عالمِ سوء ہیں اور حق کو پہچاننے کے باوجود باطل کی پیروی کرتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس میں مالی مفادات ہیں۔ مثال کے طور پر بعض صوفی علماء جانتے ہیں کہ سنت کی پیروی کرنی چاہیے لیکن اگر وہ ایسا کریں تو ان کے پاس کچھ نہیں بچے گا۔ وہ کہتے ہیں: "تم اہلِ سنت کے پاس ہے ہی کیا؟ تم تو اپنے ماننے والوں سے کچھ نہیں لیتے۔" اہلِ سنت کے علماء نہ اپنے متبعین سے کچھ لیتے ہیں اور نہ ان سے کچھ مانگتے ہیں۔

لیکن رافضی علماء اپنے پیروکاروں سے خمس مانگتے ہیں۔ پھر ان ہی پیسوں سے امریکہ و یورپ کے ہوٹلوں میں عیاشیاں کرتے ہیں اور اربوں روپے اڑاتے ہیں۔ صوفی حضرات نذورات کے ذریعے اربوں ریال جمع کرتے ہیں۔ ذرا سوچئے کہ صرف احمد البدوی کے عرس پر دو ملین سے زیادہ لوگ جمع ہوتے ہیں، ہر شخص نذر و نیاز اور پیسہ لے کر آتا ہے۔ یہ سب کون لیتا ہے؟ ان کے متولی اور گدی نشین اسے اپنی قبروں پر قبضہ جما کر کھا جاتے ہیں۔ لیکن اہلِ سنت نہ کسی سے کچھ لیتے ہیں اور نہ ہی کسی سے کوئی معاوضہ طلب کرتے ہیں۔ وہ اللہ کی آیات کو تھوڑی قیمت پر بیچنے والے نہیں ہوتے۔ اور ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ

ہمیں موت اسی حالت پر دے کہ ہم کبھی اللہ کی آیات کو دنیا کے بدلے نہ بیچیں۔ اگر کبھی ہماری کوتاہیوں کی وجہ سے اللہ کی خاص معیت اور حفاظت کم بھی ہوجائے، تب بھی ہم آیاتِ الٰہی کو ہرگز دنیا کے بدلے نہ بیچیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب تک وہ ہمیں محفوظ رکھے ہوئے ہے، اور ان شاء اللہ وہ ہمیں موت تک محفوظ رکھے گا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ذرا دیکھو! جب اللہ نے ہجرت کا حکم دیا تو کچھ لوگوں نے ہجرت کی اور کچھ نے چھوڑ دی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو سورۂ توبہ میں ذکر کیا اور لوگوں کو متنبہ کرتے ہوئے فرمایا:﴿قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ﴾

(کہہ دو! اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارا خاندان، وہ اموال جو تم نے کمائے ہیں، وہ تجارت جس کے مندی میں پڑنے سے ڈرتے ہو، اور وہ مکانات جنہیں تم پسند کرتے ہو، یہ سب تمہیں اللہ، اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو پھر انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لے آئے۔)

یہ سب محبتیں انسان کو حق چھوڑنے پر مجبور کرتی ہیں۔ کوئی اپنی قوم کی خاطر حق چھوڑ دیتا ہے، کوئی اپنی بیوی کے لیے، کوئی اپنے بچوں کے لیے، کوئی اپنے وطن کے لیے، کوئی اپنے مال و تجارت کے لیے۔

ہم کہتے ہیں: بھائی! یہ معاملہ سودی ہے۔ وہ کہتا ہے: "نعوذ باللہ، سود کہاں سے آگیا؟" پھر کہتا ہے: "شیخ نے اس کی اجازت دی ہے" حالانکہ اسے معلوم ہے کہ اس شیخ کا فتویٰ معتبر نہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس کے پیچھے پیسہ ہے، تجارت ہے، بڑے بڑے کاروبار ہیں۔ وہ تجارت کے نقصان کا خوف رکھتا ہے اور اپنے گھروں کے آباد رہنے کی خواہش۔ یہی سب اللہ اور رسول سے زیادہ محبوب ہوجاتا ہے۔

پس اکثر لوگ حق کی مخالفت انہی آٹھ محبتوں کی وجہ سے کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۗ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الْمَآبِ﴾

(لوگوں کے لیے خواہشات کی محبت خوشنما بنادی گئی ہے، جیسے عورتیں، بیٹے، ڈھیروں سونے چاندی کے خزانے، نشان لگے ہوئے گھوڑے، مویشی اور کھیتیاں۔ یہ سب دنیا کی زندگی کا سامان ہے، اور اللہ ہی کے پاس بہترین ٹھکانا ہے۔)

پس جس نے ان میں سے کسی چیز کو دلیل کے تقاضے پر مقدم کیا تو اس نے اپنی خواہش کو دلیل کے تقاضے پر مقدم کیا۔ بندے کا ایمانِ واجب اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک وہ ان نفسانی خواہشات پر دلیل کے تقاضے کو مقدم نہ کرے۔ یعنی نفس کی خواہشات جیسے مال، منصب، عزت، محبت، تجارت، اور عام دنیاوی متاع۔ یہی مراد ہے ہمارے اس قاعدے سے: "تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک اس کی خواہش میرے لائے ہوئے دین کے تابع نہ ہو۔"

اگرچہ اس کا نتیجہ یہ نکلے کہ ان محبوب چیزوں میں سے کچھ کو ترک کرنا پڑے۔ بلکہ علماء نے کہا ہے: جو کوئی ان محبوب چیزوں کو دلیل کے تقاضے پر مقدم کرتا ہے وہ اس کا دشمن ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَكُمْ فَاحْذَرُوهُمْ﴾

(اے ایمان والو! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں، لہٰذا ان سے بچو۔)

پس جو بھی حق تمہیں اس کے اتباع سے روک دے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ تمہارا دشمن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَنْ تَرْضَى عَنكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَى حَتَّى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ﴾

(اور یہود و نصاریٰ تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک کہ تم ان کے دین کی پیروی نہ کرو۔)

غور کرو! اللہ نے کیا فرمایا؟ "اللہ کی ہدایت ہی ہدایت ہے۔" اور اگر تم نے ان کی پیروی کی تو کیا ہوا؟ تو معاملہ یوں ہے: یا تو ہدایت ہے یا خواہش۔ اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے، اور اگر تم نے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو تم خواہش کی پیروی کرنے والے ہوگئے۔ پس اے ابنِ آدم! تم دو ہی چیزوں کے درمیان ہو: یا خواہش یا ہدایت۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ﴾

(پس آپ ان کے درمیان اللہ کے نازل کردہ کے مطابق فیصلہ کریں اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں۔)

تو یا تو اللہ کے نازل کردہ کے مطابق فیصلہ ہے، یعنی دلیل کا سہارا، یا خواہش کی پیروی ہے۔ کوئی تیسری چیز موجود نہیں۔ یہ نہ کہو کہ ہم کبھی دلیل کے ساتھ ہیں اور کبھی خواہش کے ساتھ، یہ ممکن نہیں۔

تم رات میں ہو یا دن میں، یا حرکت میں ہو یا سکون میں۔ تمہارے سامنے ہمیشہ ہدایت اور خواہش آمنے سامنے کھڑے ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں، نہ یہ دونوں اکٹھے ہوسکتے ہیں اور نہ دونوں کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿كَذَلِكَ أَنْزَلْنَاهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ﴾

(اسی طرح ہم نے اسے عربی فیصلہ بنا کر اتارا ہے، اور اگر آپ نے ان کی خواہشات کی پیروی کی اس علم کے بعد جو آپ کے پاس آچکا ہے...)

تو یا اللہ کے نازل کردہ کے مطابق فیصلہ ہے یا خواہش ہے۔ ان دونوں کے درمیان کوئی اور درجہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَإِنْ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَكَ فَاعْلَمْ أَنَّمَا يَتَّبِعُونَ أَهْوَاءَهُمْ﴾

(پس اگر وہ آپ کی بات نہ مانیں تو جان لیں کہ وہ صرف اپنی خواہشات کی پیروی کررہے ہیں۔)

پس جس چیز نے انہیں آپ کی اطاعت اور دلیل کے اتباع سے روکا وہ خواہش ہی تھی۔ خواہش نفس کو دلیل کے اتباع سے روکنے والی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں خواہشات سے۔ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں خواہشات سے۔ اللہ کی پناہ طلب کرو! یہ دشمن ہے، دشمن! اللہ کی پناہ لو اس سے اور اگر نجات چاہتے ہو تو اس قاعدے کو مضبوطی سے پکڑو۔

ابن القیم رحمہ اللہ نے فرمایا: اللہ نے معاملے کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، تیسرا کوئی نہیں: یا تو اللہ اور رسول کی اطاعت اور اس کے لائے ہوئے دین کی پیروی، یا پھر خواہشات کی پیروی۔ جو کچھ بھی رسول صلی اللہ علیہ وسلم نہیں لائے وہ خواہش ہے، خواہش ہی ہے۔ چاہے لوگ اسے اپنی خوبصورت باتوں سے سجائیں یا اپنے قوانین اور سیاست سے اس کو آراستہ کریں، لیکن حقیقت یہی ہے کہ وہ خواہش ہے۔

پس یہ دونوں راستے ہیں، اپنے لیے ایک راستہ منتخب کرو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءهُمْ﴾

(پس آپ دعوت دیجئے اور اسی طرح استقامت اختیار کیجیے جس طرح آپ کو حکم دیا گیا ہے اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں۔)

تو یا استقامت ہے یا خواہش۔ اللہ نے حق اور خواہش کو ایک دوسرے کے مقابل کھڑا کیا ہے۔ اس نے اللہ کے نازل کردہ فیصلے اور خواہش کو آمنے سامنے کھڑا کیا ہے۔ اس نے استقامت اور خواہش کو مقابل کیا ہے۔ اس نے علم اور خواہش کو آمنے سامنے کھڑا کیا ہے۔ پس حق، اللہ کے نازل کردہ فیصلہ، استقامت اور دلیل کے تقاضے کے مقابل میں جو چیز کھڑی ہے وہی یہ ملعون دشمن ہے، شیطان۔ خواہش ہی ہمارا دشمن ہے،

اللہ تعالیٰ نے آیات میں یہ بات بار بار ذکر کی ہے (اگرچہ ہم سب آیات نقل نہیں کریں گے کیونکہ وہ طویل ہیں) لیکن اے بھائیو! سمجھو کہ یہی وہ چیز ہے جو لوگوں کو دلائل کی تعظیم سے روک دیتی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو لوگوں کو اکثر دلائل کے معانی رد کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ اس لیے نہیں کہ وہ اپنے دل میں انکار کرتے ہیں، بلکہ وہ دل ہی دل میں جانتے ہیں کہ یہ حق ہے، وہ اس بات پر مطمئن ہیں کہ یہ حق ہے۔ لیکن... خواہش! خواہش کی وجہ سے وہ مخالفت کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ﴾

(پس وہ آپ کو جھوٹا نہیں کہتے بلکہ یہ ظالم اللہ کی آیات سے انکار کرتے ہیں۔)

اور فرمایا: وہ جانتے ہیں کہ یہ سب کچھ ربّ السماوات والارض کی طرف سے بصیرت کے طور پر اتارا گیا ہے، لیکن انہیں معلوم ہے کہ اگر وہ اسلام قبول کریں گے تو ان کے قاضی ان کے خلاف ہوجائیں گے اور ان کا تختہ الٹ دیا جائے گا۔ پس انہوں نے اپنے ملک کو اس پر ترجیح دی۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خط کسریٰ کے پاس پہنچا تو اس نے کیا کیا؟ اس نے خط کو پھاڑ ڈالا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر کیا فرمایا؟ "اس خبیث نے اپنے ملک پر غرور کیا ہے، اللہ اس کی سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے کردے۔" تو اللہ تعالیٰ نے اس کی سلطنت کو پارہ پارہ کردیا۔ ایک عظیم متحد سلطنت کئی ٹکڑوں میں بٹ کر باہم لڑنے والے چھوٹے چھوٹے ملکوں میں تقسیم ہوگئی۔

ابن القیم رحمہ اللہ نے فرمایا: "بھائیو! سمجھو کہ صحیح فہم ایک نور ہے جو اللہ بندے کے دل میں ڈال دیتا ہے۔ اس نور کے ذریعے وہ حق و باطل، ہدایت و ضلالت، گمراہی و رشد میں فرق کرتا ہے۔ یہ نور حسنِ نیت سے پروان چڑھتا ہے۔ یعنی صحیح فہم کا فیض اچھی نیت اور باطنی تقویٰ سے بڑھتا ہے، ظاہر و باطن میں اللہ کے خوف سے بڑھتا ہے۔"پھر فرمایا: "اس نور کی غذا کو کاٹ دینے والی چیز خواہش کی پیروی ہے، دنیا کی رغبت ہے، مخلوق کی محبت ہے، اور تقویٰ کو چھوڑ دینا ہے۔" خواہش کی پیروی ہی وہ چیز ہے جو حق کے نور کو بجھا دیتی ہے۔ ایسی حالت میں فطرت اندھی ہوجاتی ہے، العیاذ باللہ انسان معروف کو منکر اور منکر کو معروف سمجھنے لگتا ہے۔ اہلِ دین اور اہلِ استقامت کو دشمن قرار دیتا ہے اور دشمنوں کو دوست سمجھ لیتا ہے۔

یہ نورِ فطرت کب بجھتا ہے؟ خواہش کی وجہ سے۔ خواہش ہی وہ چیز ہے جو سلامتیِ فطرت اور بصیرت کے نور کو بجھا دیتی ہے۔ خواہش اندھیرا ہے، اندھیرا ہے بھائیو! اور اللہ کی قسم! جو اپنی خواہش کا غلام بن گیا وہ اندھیرے میں جیتا ہے، اور اس اندھیرے میں کبھی کوئی روشنی نہیں ہوتی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ أَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ﴾

(کیا آپ نے اُس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو ہی اپنا معبود بنا لیا، تو اللہ نے اسے علم کے باوجود گمراہ کر دیا؟)

یہ خواہش پرستی کے پہلے اثرات ہیں: گمراہی۔

پھر فرمایا: اور اُس کے کان اور اُس کے دل پر مہر لگا دی، اور اُس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا۔یعنی اُس کا باطن بھی اندھا ہے اور ظاہر بھی اندھا ہے۔ وہ اندھا ہے، اُس کی آنکھ ہے مگر وہ اُس سے نہیں دیکھتا، اُس کا دل ہے مگر وہ اُس سے نہیں سمجھتا، اُس کے کان ہیں مگر وہ اُن سے نہیں سنتا۔ یہ سب کس نے مٹا دیا؟ خواہش نے۔ یہی خواہش، یہ ملعون خواہش۔ یہ سب سے بڑا شیطان ہے۔ یہی خواہش، یہ شہوت پرستی ہے۔

اسی لیے ہم میں سے کوئی اس وقت تک سچا مومن نہیں بن سکتا جب تک اُس کی خواہش محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیمات کے تابع نہ ہو جائے۔

پس جان لو کہ لوگوں کو حق کے خلاف جانے پر اُبھارنے والی چیز صرف اور صرف خواہشات کی پیروی ہے۔ خواہشات کی پیروی ہی وہ چیز ہے جو لوگوں کو حق کی پیروی سے روک دیتی ہے۔

میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ سب کی نیتوں کو اہلِ حق والوں میں شامل کر دے۔

چوتھا درس

الحمد للہ رب العالمین، تمام تعریفیں اللہ رب العالمین کے لیے ہیں، اور درود و سلام رسولِ امین صلی اللہ علیہ وسلم پر، اور اُن کے اہلِ بیت اور پاکیزہ صحابہ پر، اور اُن سب پر جو قیامت تک اُن کی نیک پیروی کریں۔ --- اس کے بعد...

یہ قاعدہ جسے ہم بیان کر رہے ہیں اس کا عنوان ہے ﴿قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ﴾: "کہہ دو اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو۔" اور آپ لوگ جانتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب سورۃ آلِ عمران کی آیت ہے۔ اس کی اصل اللہ کا یہ فرمان ہے: "کہہ دو اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تمہیں محبوب بنا لے گا اور تمہارے گناہ معاف فرما دے گا، اور اللہ بڑا بخشنے والا نہایت رحم کرنے والا ہے۔"

پس اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ کریمہ میں صاف بیان فرما دیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنا اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے کا سبب ہے۔ لہٰذا جو چاہتا ہے کہ اللہ اُس سے محبت کرے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرے۔ اس میں یہ دلیل بھی ہے کہ رسول اللہ کی اطاعت دراصل اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مفہوم کو اپنے فرمان میں واضح کیا ہے: "جس نے رسول کی اطاعت کی اُس نے اللہ کی اطاعت کی۔" اور اپنے فرمان میں فرمایا: "رسول تمہیں جو کچھ دے وہ لے لو اور جس چیز سے منع کرے اُس سے باز آجاؤ۔"

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے بارے میں فرمایا: یہ آیت ہر اُس شخص پر حجت ہے جو دعویٰ کرے کہ وہ اللہ سے محبت کرتا ہے، مگر وہ طریقۂ محمدیہ پر نہ ہو، تو وہ اپنی اس دعویٰ میں جھوٹا ہے۔ یعنی ہر وہ شخص جو کہے کہ "میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتا ہوں" لیکن ہم اُسے دیکھتے ہیں کہ نہ وہ آپﷺ کے اقوال کی پیروی کرتا ہے اور نہ آپﷺ کے اعمال کی، تو وہ اپنی اس دعویٰ میں جھوٹا ہے۔ پھر ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: وہ اپنی

اس دعویٰ میں جھوٹا ہے جب تک کہ وہ شریعتِ محمدیہ اور دینِ نبوی کی تمام باتوں اور احوال میں اتباع نہ کرے۔ ــــ ختم کلام۔

اس قاعدے پر بہت سی دلیلیں ہیں۔ اُن میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ صحیحین میں عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس نے ہمارے دین میں کوئی نئی بات ایجاد کی جو اُس میں سے نہیں تو وہ مردود ہے۔" یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اتباع واجب ہے۔ اور امام مسلم کی روایت میں ہے: "جس نے کوئی ایسا عمل کیا جو ہمارے طریقے کے مطابق نہیں، وہ مردود ہے۔"

پس جو بھی دعویٰ کرے کہ "میں اللہ سے محبت کرتا ہوں" ہم دیکھیں گے کہ اُس کا طریقہ رسول اللہ کے منہج کے ساتھ کیسا ہے۔ کیونکہ اللہ سے محبت کی علامت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ہے۔ خواہ دین کے اصول ہوں یا فروع، اقوال ہوں یا اعمال، عقائد ہوں یا شریعت کے تمام ظاہر و باطن احکام ــــ سب میں رسول کی پیروی کرنی ہوگی۔ اگر کوئی رسول کی اتباع کرتا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اُس کا دعویٰ "میں اللہ اور رسول سے محبت کرتا ہوں" سچا ہے۔

ہم نے اس کتاب میں بہت سی احادیث ذکر کی ہیں جو اتباعِ رسول کے وجوب پر دلالت کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک مسلم کی صحیح روایت ہے، جابر رضی اللہ عنہ سے: نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر خطبے میں فرمایا کرتے تھے: "اما بعد! بے شک سب سے سچی بات اللہ کی کتاب ہے اور سب سے بہتر ہدایت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت ہے، اور سب سے بُری بات نئی بدعتیں ہیں، اور ہر بدعت گمراہی ہے۔"

اسی طرح صحیح بخاری میں جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس فرشتے آئے جبکہ آپ سو رہے تھے۔ انہوں نے کہا: تمہارے ساتھی کی ایک مثال ہے، اس کے لیے کوئی مثال بیان کرو۔ بعض نے کہا: یہ تو سو رہا ہے۔ بعض نے کہا: آنکھ سو رہی ہے مگر دل جاگ رہا ہے۔ تو انہوں نے کہا: اس کی مثال ایک ایسے شخص کی ہے جس نے ایک گھر بنایا اور اُس میں دعوت کا کھانا رکھا اور لوگوں کو بلایا۔ جس نے بلانے والے کی بات مانی وہ گھر میں داخل ہوا اور کھانا کھایا، اور جس نے نہ مانا وہ نہ گھر میں داخل ہوا اور نہ کھانا کھایا۔ پھر فرشتوں نے کہا: اس کی تعبیر کرو تاکہ یہ سمجھ لے۔ بعض نے کہا: یہ سو رہا ہے۔ بعض نے کہا: آنکھ سو رہی ہے مگر دل جاگ رہا ہے۔ پھر کہا: وہ گھر جنت ہے، وہ بلانے والا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ پس جس نے

محمد کی اطاعت کی اُس نے اللہ کی اطاعت کی، اور جس نے محمد کی نافرمانی کی اُس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اور محمد لوگوں کے درمیان فرق کرنے والے ہیں۔

صحیحین میں انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: تین آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے گھروں میں آئے اور آپ کی عبادت کے بارے میں پوچھا۔ جب اُنہیں بتایا گیا تو وہ گویا اُسے کم سمجھے اور کہا: ہم رسول اللہ کے برابر کہاں؟ آپ کے تو پچھلے اور اگلے سب گناہ معاف ہیں۔ پھر اُن میں سے ایک نے کہا: میں ہمیشہ رات بھر نماز پڑھوں گا، نہیں سوؤں گا۔ دوسرے نے کہا: میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا، نہیں چھوڑوں گا۔ تیسرے نے کہا: میں عورتوں سے کنارہ کش رہوں گا اور کبھی شادی نہیں کروں گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے پاس آئے اور فرمایا: کیا تم ہی وہ لوگ ہو جنہوں نے یہ کہا؟ انہوں نے کہا: جی ہاں۔ تو آپ نے فرمایا: اللہ کی قسم! میں تم سب سے زیادہ اللہ کو جاننے والا اور اُس سے سب سے زیادہ ڈرنے والا ہوں، لیکن میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، اور عورتوں سے شادی بھی کرتا ہوں۔ اور جس نے میری سنت سے منہ موڑا وہ مجھ میں سے نہیں۔

پس جو رسول اللہ کی سنت سے اعراض کرتا ہے وہ حقیقت میں اللہ سے محبت نہیں کرتا، چاہے وہ اللہ کی تعریف کے الفاظ سے اپنے منہ بھر دے، وہ جھوٹا ہے۔ کیونکہ اللہ کی محبت کی سچی علامت رسول کی اتباع ہے۔

صحیحین میں عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسا کام کیا جس میں آپ نے رخصت دی تھی۔ کچھ لوگوں نے اُس سے بچنے کا رویہ اختیار کیا۔ جب یہ بات رسول اللہ کو پہنچی تو آپ نے لوگوں کو خطبہ دیا، اللہ کی حمد و ثنا کی، پھر فرمایا: "کیا وجہ ہے کہ کچھ لوگ اُس چیز سے اجتناب کرتے ہیں جو میں کرتا ہوں؟ اللہ کی قسم! میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور پرہیزگار ہوں۔"

صحیح مسلم میں ابو رافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو لوگ کھجوروں کو بارآور کر رہے تھے۔ آپ نے پوچھا: تم کیا کر رہے ہو؟ کیونکہ آپ مکہ کے رہنے والے تھے جو بےآب و گیاہ وادی ہے۔ انہوں نے کہا: ہم یہ کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: شاید اگر تم نہ کرو تو بہتر ہو۔ تو انہوں نے چھوڑ دیا، پھر پیداوار کم ہوگئی۔ انہوں نے آپ سے ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: "اے لوگو! میں بھی تو ایک انسان ہوں، جب میں تمہیں دین کے کسی معاملے

میں کچھ کہوں تو اُسے لے لو، اور جب میں اپنی رائے سے کچھ کہوں تو میں بھی تو ایک انسان ہوں۔"

اس بارے میں دلیلیں بہت ہیں۔ صحیحین میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میری اور تمہاری مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی نے آگ جلائی، جب اُس نے اردگرد روشن کر دیا تو پروانے اور جانور اُس میں گرنے لگے، اور وہ انہیں روکتا ہے مگر وہ اُس پر غالب آ کر اُس میں کود پڑتے ہیں۔" آپ نے فرمایا: "میں تمہیں آگ سے روک رہا ہوں، اِدھر آؤ آگ سے بچو! مگر تم ہو کہ مجھ پر غالب آ کر آگ میں گھس جاتے ہو۔"

بخاری اور مسلم دونوں نے ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ’میری مثال اور اس ہدایت و علم کی مثال جس کے ساتھ اللہ نے مجھے مبعوث فرمایا ہے، بڑی بارش کی طرح ہے جو زمین پر برسی۔ ان زمینوں میں ایک حصہ اچھی اور زرخیز تھا، اس نے پانی کو قبول کیا اور گھاس اور سبزہ کثرت سے اگا دیا۔‘‘ اور کچھ زمین ایسی تھیں جو پانی کو روک لیتی تھیں، تو اللہ نے ان کے ذریعے لوگوں کو نفع پہنچایا، چنانچہ انہوں نے اس سے پانی پیا، اپنے جانوروں کو پلایا اور کھیتوں کو سیراب کیا۔یعنی کچھ لوگ ایسے ہیں جو علم حاصل کرتے ہیں، اس پر عمل بھی کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچاتے ہیں، جیسے کہ وہ خود پیتے ہیں اور دوسروں کو بھی پلاتے ہیں۔اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو علم تو حاصل کرتے ہیں لیکن اس پر پورا عمل نہیں کرتے، وہ ان زمینوں کی مانند ہیں جو پانی کو روک لیتی ہیں لیکن خود اسے نہیں پیتیں، مگر دوسرے لوگ ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہ لوگوں کو تعلیم دیتے ہیں لیکن اپنی ذات میں صرف فرائض تک محدود رہتے ہیں۔ اگر کوئی عالم نوافل کے ترک پر عمل نہیں کرتا حالانکہ وہ ان کے دلائل جانتا ہے تو اس پر ملامت نہیں، بس فرائض پر قائم رہے۔ یہی مثال ہے اس زمین کی جو پانی روک کر دوسروں کو فائدہ پہنچائے۔ اور کچھ زمینیں ایسی ہیں جو بالکل بانجھ ہیں، نہ پانی کو روکتی ہیں اور نہ سبزہ اگاتی ہیں۔ یہ مثال ان لوگوں کی ہے جو دین میں سمجھ بوجھ نہیں رکھتے اور نہ اس ہدایت سے فائدہ اٹھاتے ہیں جس کے ساتھ نبی ﷺ کو بھیجا گیا۔

دلائل بہت ہیں، و للہ الحمد۔

امام ابو داود نے اپنی سنن میں صحیح سند کے ساتھ ابو رافع رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: میں ہرگز نہ پاؤں تم میں سے کسی کو اپنی

چارپائی پر ٹیک لگائے ہوئے، اس کے پاس میرے کسی حکم یا ممانعت کی خبر پہنچے، اور وہ کہے: ہمیں نہیں معلوم، ہمارے پاس تو اللہ کی کتاب ہے۔‘‘

اور ابو داود نے ہی ایک اور صحیح سند کے ساتھ مقدام بن معدی کرب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:قریب ہے کہ ایک آدمی سیر ہو کر اپنی چارپائی پر ٹیک لگائے ہوئے کہے: تمہارے لیے بس یہی قرآن ہے، جو کچھ اس میں حلال پاؤ اسے حلال سمجھو اور جو کچھ اس میں حرام پاؤ اسے حرام سمجھو۔‘‘

یعنی وہ صرف قرآن کو کافی سمجھے اور حدیث کو ترک کر دے۔پھر نبی ﷺ نے فرمایا:خبردار! رسول اللہ نے جو کچھ حرام قرار دیا وہ بھی بالکل اسی طرح حرام ہے جیسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔‘‘امام ترمذی نے ایک ایسی سند کے ساتھ جو قابلِ اعتبار ہے، عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

کیا ایک آدمی یہ سمجھتا ہے کہ اللہ نے صرف وہی چیزیں حرام کی ہیں جو اس قرآن میں مذکور ہیں؟ سن لو! میں بھی چیزوں کو حرام قرار دیتا ہوں، نصیحت کرتا ہوں اور حکم دیتا ہوں، اور یہ سب قرآن کے مثل یا اس سے زیادہ ہیں۔‘‘

امام احمد اور ابو داود نے بھی صحیح سند کے ساتھ عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:میں تمہیں اللہ کے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں، اور سننے اور اطاعت کرنے کی۔ خواہ تم پر حبشی غلام ہی کیوں نہ مقرر کر دیا جائے۔ تم میں سے جو زندہ رہے گا وہ بہت زیادہ اختلاف دیکھے گا، لہٰذا تم میری سنت اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت کو لازم پکڑو۔ اس کو مضبوطی سے تھام لو، دانتوں سے پکڑ کر رکھو۔ اور نئی پیدا کی ہوئی باتوں سے بچو، کیونکہ ہر نئی بات بدعت ہے، اور ہر بدعت گمراہی ہے۔‘‘اور اسی طرح بہت سی احادیث موجود ہیں جو سب کی سب اسی اصول پر جمع ہوتی ہیں، کہ اللہ نے فرمایا:کہہ دو! اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تمہیں محبوب بنا لے گا۔‘‘اور میں نہیں سمجھتا کہ اس اصول کو مزید فروعی تفصیل کی ضرورت ہے، جو چاہے وہ اس کی تفصیل مذکورہ رسالہ میں دیکھ سکتا ہے۔اور اصولوں میں سے ایک اور قاعدہ یہ ہے کہ: صحیح حدیث بذاتِ خود حجت ہے۔

"لہٰذا جان لیجیے، اللہ آپ پر رحم کرے، کہ سنت میں ایسا کوئی صحیح حدیث موجود نہیں ہے جس پر تمام ائمہ نے بالاتفاق عمل ترک کر دیا ہو۔ اور یہ کبھی

ممکن نہیں کہ امت اس چیز کو جس کا ثبوت شریعت میں ہے، بالکل چھوڑ دے؛ کیونکہ یہ تو گمراہی پر اجماع کرنے کے مترادف ہوگا۔"۔لہٰذا سنت میں جو بھی حدیث صحیح ثابت ہوئی، اس پر امت کے کسی نہ کسی گروہ نے عمل ضرور کیا ہے، خواہ وہ گروہ تھوڑا ہو یا زیادہ۔ اور جو عالم یہ کہتا ہے کہ فلاں حدیث پر کسی نے عمل نہیں کیا، تو وہ دراصل اپنے علم کی خبر دیتا ہے، ورنہ ''کسی کے علم میں نہ ہونا'' یہ دلیل نہیں کہ وہ چیز وجود ہی نہیں رکھتی۔

(سمجھے؟) اچھا۔ ہمارا قاعدہ یہ ہے کہ اگر بالفرض کوئی صحیح حدیث ایسی ہو جس پر کسی نے عمل نہ کیا ہو، تو بھی یہ بات اس کی حجیت پر اثر انداز نہیں ہوگی، کیونکہ صحیح حدیث بذاتِ خود حجت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے اقوال کسی کے عمل سے حجت نہیں بنتے، بلکہ وہ اپنی ذات میں حجت ہیں۔اگر ان پر عمل کیا جائے تو بھی وہ حجت ہیں، اور اگر عمل نہ کیا جائے تو بھی وہ حجت ہی رہیں گے۔پس سنت اپنی ذات کے اعتبار سے حجت ہے، نہ کہ کسی اور چیز کے ذریعے۔

اس کے برعکس:پہلے شریعتیں حجت ہیں لیکن بذاتِ خود نہیں بلکہ کسی اور کے ذریعے۔

صحابہ کا قول حجت ہے لیکن کسی اور کے ذریعے۔

اجماع حجت ہے لیکن کسی اور کے ذریعے۔

عرف حجت ہے لیکن کسی اور کے ذریعے۔

مصلحت حجت ہے لیکن کسی اور کے ذریعے۔

استقراء حجت ہے لیکن کسی اور کے ذریعے۔

لیکن کتاب اور سنت حجت ہیں اپنی ذات سے۔

آیت بذاتِ خود حجت ہے۔ حدیث بذاتِ خود حجت ہے۔

یعنی دلیل قرآن و سنت کی حجیت ایک ایسی صفت ہے جو اس میں راسخ ہے، اور اپنی ذات میں ثابت ہے۔ کیونکہ وہ قرآن ہے تو بذاتِ خود حجت ہے۔ وہ حدیث ہے تو بذاتِ خود حجت ہے۔ خواہ علماء نے اس پر عمل کیا ہو یا نہ کیا ہو۔اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ ''اگر یہ حدیث حجت ہوتی تو امام مالک اسے نہ چھوڑتے'' یہ بات بالکل باطل ہے۔ یا یہ کہنا کہ ''اگر یہ حدیث حجت ہوتی تو اہلِ مدینہ ضرور اس پر عمل کرتے'' یہ بھی باطل ہے۔ --- یا یہ کہنا کہ

''اگر یہ حدیث صحیح ہوتی تو فلاں کمیٹی یا فلاں فقہی جماعت یا فلاں عالم اس پر عمل نہ چھوڑتے'' یہ سب باتیں حجت کے اعتبار سے بے وزن ہیں۔۔ ایسا کہنا دراصل دلیل کی تعظیم نہ کرنے کے مترادف ہے۔ لہٰذا دلیل کی تعظیم کا تقاضا یہ ہے کہ پکا یقین رکھا جائے کہ قرآن اور سنت کی حجیت بذاتِ خود ہے، اور ان کے اندر ایک راسخ صفت ہے۔لہٰذا جب سنت صحیح ثابت ہو جائے تو وہ اپنی ذات میں حجت ہے۔ تو خبردار رہو کہ کسی حدیث کو، جس کی صحت ثابت ہو چکی ہو، اس لیے رد نہ کرو کہ فلاں عالم یا فلاں امام یا فلاں مذہب نے اس پر عمل نہیں کیا۔ اس سے بچو۔ اسی وجہ سے میں نے اس قاعدے کو "تعظیمِ دلیل" کے قواعد میں شامل کیا ہے۔

حاشیہ (حجت بالغیر (کسی اور کے واسطے سے حجت)

اس سے مراد وہ دلائل ہیں جن کی حجیت خود ان کی ذات سے نہیں بلکہ کسی دوسری اصل یا ماخذ کے اعتراف و ثبوت سے آتی ہے۔ ،،،،مثالیں: شرع من قبلنا: سابقہ امتوں کی شریعت ہمارے لیے اس وقت تک حجت ہے جب تک قرآن و سنت نے اسے باقی رکھا ہے۔

قولِ صحابی: صحابی کا قول اپنی ذات میں شریعت نہیں، لیکن چونکہ صحابہ نبی ﷺ کے علم و دین کو سب سے بہتر سمجھتے تھے، اس لیے ان کا قول بالغیر حجت ہے۔

اجماع: اجماع بذاتِ خود دلیل نہیں، بلکہ اس لیے دلیل ہے کہ قرآن و سنت نے اس کو دلیل قرار دیا ہے ("وَمَن يُشَاقِقِ الرَّسُولَ ... وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ ...")۔

عرف، مصلحت، استقراء: یہ سب اپنی ذات میں شریعت نہیں، بلکہ ان کی حیثیت اس وقت دلیل کی ہوتی ہے جب انہیں قرآن و سنت یا اصولِ شریعت سہارا دیں۔

استقراء" علمی اصطلاح میں: کسی جزوی اور بار بار دہرائے جانے والے واقعات کو جمع کر کے ایک کلی اصول اخذ کرنا۔)

یہ قاعدہ ہمیں ایک اور فائدہ بھی دیتا ہے، اور وہ یہ کہ جب کبھی ایک طرف دلیلِ ذاتی (حجتِ ذاتی) ہو اور دوسری طرف دلیلِ تبعی ہو تو مقدم کون سی ہوگی؟ یقیناً حجتِ ذاتی۔ پس اگر تمہارے امام، عالم، یا تمہارا اپنا قول یا تمہارے مذہب کا قول دلیل کے مقابل آجائے تو یہاں حجتِ ذاتی اور حجتِ تبعی میں تعارض ہو گیا۔ ایسے موقع پر تمہیں حجتِ ذاتی کو لینا ہے، اور عالم کے قول کو چھوڑ دینا ہے، کیونکہ اس کی حجیت بالذات نہیں بلکہ بالغیر ہے، جبکہ دلیل کی حجیت بذاتِ خود ہے۔

اسی لیے میں طالب علموں کے سامنے بلند آواز سے کہتا ہوں:عُلماء کے اقوال اور متون کو یاد کرنے میں اپنی ساری توجہ ضائع مت کرو، بلکہ کتاب و سنت کو یاد کرنے پر زور دو۔ کیوں؟

کیونکہ کتاب و سنت کو اگر تم نے یاد کیا تو وہ بذاتِ خود حجت ہیں، ان کی حجیت ثابت کرنے کے لیے تمہیں کسی اور چیز کی حاجت نہیں۔ لیکن اگر تم نے "زاد المستقنع" جیسی کتاب یاد کی، تو یاد کرنے کے بعد تمہیں یہ دیکھنے کے لیے پھر دلیل پڑھنی پڑے گی کہ آیا اس میں جو کچھ ہے وہ صحیح بھی ہے یا نہیں۔ اس لیے طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ حفظ کا آغاز کتاب و سنت سے کرے۔ اگر اللہ نے تمہیں مضبوط حافظہ دیا ہے تو اس کو سنت زیادہ سے زیادہ یاد کرنے میں استعمال کرو۔ میں نے دیکھا ہے کہ طلابِ علم میں امتیاز صرف ان ہی کو حاصل ہوتا ہے جو سنت زیادہ یاد کرتے ہیں۔

قرآن تو امت کا اکثر حصہ یاد کرتا ہے، لیکن جب قرآن کے ساتھ سنت کا زیادہ حصہ بھی یاد کر لیا جائے تو یہ بہت بڑی نعمت ہے۔ پس اے طالب علم**!** صرف "عمدة الأحكام" یا "بلوغ المرام" تک محدود نہ رہو، بلکہ اگر تمہارا دل ابھی اور یاد کرنے کی خواہش رکھتا ہے تو صحیحین (بخاری و مسلم) اور سننِ اربعہ کی طرف بڑھو، اور زیادہ سے زیادہ یاد کرو۔ ہمارے ساتھ یونیورسٹی میں ایک طالب علم تھا جو جیزان سے آیا تھا، وہ تیرہ ہزار احادیث اسناد کے ساتھ یاد رکھتا تھا۔ میں نے اس سے اس کا طریقہ پوچھا (اور میں یہ پہلے بھی درسوں میں ذکر کر چکا ہوں) تو اس نے کہا: میں روزانہ صرف پانچ احادیث اسناد کے ساتھ یاد کرتا ہوں، اور یہ عمل لمبے عرصے تک جاری رہا۔ میں نے پوچھا: کیا تم "زاد" یاد کرتے ہو؟ اس نے کہا: نہیں۔

"تین اصول" یاد کرتے ہو؟ کہا: نہیں۔

"کشف الشبہات" یاد کرتے ہو؟ کہا: نہیں۔

اس کا طریقہ مجھے بہت پسند آیا، کیونکہ جب تم کسی عالم کی بات یاد کرتے ہو تو پھر اس کی صحت کے دلائل ڈھونڈنے پڑتے ہیں، لیکن اگر براہِ راست حدیث یاد کرو تو یہ ضائع نہیں ہوتا۔

"صحابہ کا علم صرف تین چیزوں سے ممتاز تھا: قرآن کا حفظ، سنت کا ضبط (یاد رکھنا اور آگے پہنچانا)، اور احکام کے استنباط کے طریقوں کی معرفت (یعنی اصولِ فقہ)۔ نبی اکرم ﷺ صحابہ کو اصولِ فقہ پڑھاتے تھے، لیکن وہ نظری اور کتابی انداز میں نہیں بلکہ عملی طور پر۔ وہ ان کے سامنے اصولِ فقہ کو عملاً نافذ کرتے۔"

"میری ایک مختصر سی رسالہ ہے، جس میں ان احادیث کا ذکر کیا گیا ہے جن میں اصولی قواعد پائے جاتے ہیں، وہ قواعد جو نبی اکرم ﷺ صحابہ کو پڑھاتے اور ان کا امتحان لیتے، تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ صحابہ قرآن، سنت اور استنباط کے طریقوں (اصولِ فقہ) میں ممتاز تھے۔"

"ان کے پاس نہ الفیات تھیں (بڑے منظوم نصاب جیسے الفیہ ابن مالک یا الفیہ اصول فقہ وغیرہ)، نہ فقہی متون (فقہ کی کتابچیاں) جنہیں وہ حفظ کرتے تھے، نہ ہی منظومات (شعری فقہی نصاب)۔ اس کے باوجود آج کے تمام علماء مل کر بھی ان کے علم کے سامنے صرف ایک قطرہ ہیں اس سمندر میں۔ اور ان کی فضیلت صرف اسی وجہ سے ہے کہ انہوں نے صحابہ سے لیا۔"

"تو پھر ہم لوگوں کو کیوں بہت زیادہ متون میں مشغول کرتے ہیں اور ان کے ذریعے قرآن و سنت کے حفظ اور علم کو پیچھے ہٹا دیتے ہیں؟ اصل تو یہ ہے کہ قرآن و سنت کی طرف توجہ دو، اور سب سے پہلے انہی کے حفظ سے آغاز کرو۔

"اصل یہ ہے کہ صحیح حدیث اپنی ذات میں ہی دلیل ہے۔ کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی ایسی چیز کی مخالفت کرے جس کے بارے میں نصوص صحیح ثابت ہو چکی ہوں۔"

"اس کے بعد جو قاعدہ ہے، میں نے اختصار شروع کر دیا ہے، لیکن ان واضح قواعد میں سے یہ قاعدہ ہے جس پر ہم زیادہ نہیں رکیں گے۔"

"علماء کے اقوال کے لیے ہم جھکتے ہیں، ان کے ذریعے نہیں (یعنی دلیل براہِ راست قرآن و سنت ہے، علماء کے اقوال محض رہنمائی ہیں)۔ چنانچہ جب ہم کسی علمی یا عملی مسئلے پر دلیل مانگیں تو کسی کو یہ حق نہیں کہ ہم سے کہا جائے کہ اس کی دلیل فلاں عالم کا قول ہے، یا یہ کہ فلاں عالم نے اس میں ایسا اور ایسا موقف اختیار کیا ہے، یا فلاں ادارے نے اس بارے میں فتویٰ دیا ہے۔ اس طرح کی باتیں دلیل نہیں ہو سکتیں، کیونکہ یہ سب صرف علماء کے اقوال، اجتہادات اور آراء ہیں۔ اور یہ شریعت پر حاکم نہیں بن سکتیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان کے پیچھے کوئی معتبر دلیل ہو جو اہلِ علم کے ہاں قابلِ اعتماد ہو۔"

"جی ہاں، علماء کے اقوال سے روشنی لی جا سکتی ہے، ان سے رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ وہ ہمارے لیے چراغ کی طرح ہیں جن کے ذریعے ہم صحیح فہم تک پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن ہم یہ عقیدہ نہیں رکھتے کہ علماء کے اقوال بذاتِ

خود دلیل ہیں۔ بلکہ ہمارا ماننا یہ ہے کہ یہ اقوال ایسے دعوے ہیں جنہیں دلیل کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"اسی لیے ہمیں کسی ایک عالم کا ایسا ہونا معلوم نہیں کہ اس نے اپنی امت کو یہ لازم قرار دیا ہو کہ وہ اس کے اقوال کو ہر حال میں لیں۔ ہمیں کسی بھی عالم کے بارے میں یہ معلوم نہیں کہ اس نے اپنی امت کو اپنے اجتہادات پر پابند کیا ہو۔ بلکہ یہ بات تمام علماء کا اجماعی فیصلہ ہے کہ ان کے اقوال بذاتِ خود دلیل نہیں ہیں۔"

"لہٰذا، تمہارے لیے جائز نہیں کہ فلاں عالم کے قول کو دلیل بنا کر پیش کرو، اور نہ ہی یہ کہ اسے کسی نزاع میں فیصلہ کن مان لو، اور نہ یہ کہ تم اسے اس طرح تعظیم دو کہ اس کے ذریعے صحیح دلائل کی مخالفت کرنے لگو۔ بلکہ عالم کا قول ہمیشہ ایسا ہوتا ہے جسے صحت کے لیے کسی سہارے اور کسی واضح دلیل کی ضرورت ہو۔"

"اسی لیے علماء نے کہا ہے: علماء کے اقوال محض دعوے ہیں جنہیں ثبوت کے لیے دلیلوں کی ضرورت ہوتی ہے۔"

اگلا قاعدہ یہ ہے کہ "دلیل اہلِ مدینہ کے عمل پر مقدم ہے"۔ اس پر پہلے بھی گفتگو ہو چکی ہے، لیکن میں مزید چند مثالیں دوں گا۔

مثال کے طور پر: صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ اقامت میں "قد قامت الصلاۃ" دو بار کہا جائے۔ انسؓ کی حدیث میں ہے کہ بلالؓ کو حکم ہوا کہ اذان کو دو دو بار کہے اور اقامت کو ایک ایک بار، سوائے "قد قامت الصلاۃ" کے کہ وہ دو بار کہے۔ اسی طرح عبداللہ بن زیدؓ اور ابن عمرؓ کی حدیثوں میں بھی یہ بات آئی ہے۔

لیکن مالکیہ کے ہاں "قد قامت الصلاۃ" ایک ہی بار کہا جاتا ہے، کیونکہ اہلِ مدینہ کا عمل یہی تھا۔ پس انہوں نے ان صحیح احادیث کو رد کر دیا۔ لیکن کیا یہ صحیح احادیث رد کرنے کی حجت ہے؟ جواب ، بالکل نہیں۔

اسی طرح صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ فرض نماز کے سلام میں دو بار سلام پھیرا جائے: ایک دائیں طرف اور ایک بائیں طرف۔ لیکن مالکیہ صرف ایک سلام پر اکتفا کرتے ہیں، اور ان کی حجت یہی ہے کہ اہلِ مدینہ کا عمل ایسا تھا۔ لیکن یہ بھی صحیح احادیث کو رد کرنے کی حجت نہیں۔

اسی طرح صحیح مسلم میں ابوہریرہؓ کی حدیث سے ثابت ہے کہ نبی ﷺ نے سورۂ انشقاق میں "فما لهم لا يؤمنون، وإذا قرئ عليهم القرآن لا يسجدون" پر سجدہ کیا۔ لیکن مالکیہ کہتے ہیں کہ یہاں سجدہ نہیں ہے، کیونکہ اہلِ مدینہ کا عمل یہ نہیں تھا۔ کیا یہ صحیح احادیث کو رد کرنے کی حجت ہے؟ ہرگز نہیں۔

پس دلیل کی تعظیم یہ ہے کہ اہلِ مدینہ کے عمل کے مقابل بھی اسے نہ چھوڑا جائے۔ اگرچہ اہلِ مدینہ کے ہمارے اوپر بڑے احسانات اور عظیم فضائل ہیں، لیکن حق سب سے زیادہ مقدم ہے۔

اگلا قاعدہ یہ ہے کہ: مذاہب اور اقوال دلیل کے تابع ہیں، دلیل مذاہب کے تابع نہیں۔

"اور قواعد میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے، اور یہ قواعد دراصل دلیل کی تعظیم کے ہیں: کہ مذاہب اور اقوال دلیل کے تابع ہیں، نہ کہ دلیل مذاہب و اقوال کے تابع ہو۔ مذاہب اور اقوال دلیل کے تابع ہوتے ہیں، اس کے برعکس نہیں۔"

"یہی وہ حق ہے جس کے سوا کوئی اور عقیدہ رکھنا جائز نہیں۔ پس یہ درست نہیں کہ تم دلائل کو اس طرح ڈھالو کہ وہ تمہارے امام کے مذہب کے مطابق ہو جائیں۔ بلکہ واجب یہ ہے کہ تم ہر اس چیز کو چھوڑ دو جو قرآن و سنت کی صحیح دلیل کے خلاف ہو، خواہ اپنے امام کے تعظیم و احترام میں تم کتنی ہی بلندی پر کیوں نہ پہنچ گئے ہو۔"

"پس اے عزیز! تمہارے لیے یہ درست نہیں کہ اپنے دل میں اپنے مذہب یا اپنے اہلِ وطن کے مذہب کی تعظیم تمہیں اس بات پر آمادہ کرے کہ تم قرآن و سنت کی دلائل کو چھوڑ دو۔ تو جب بھی تم یہ عقیدہ رکھو کہ دلائل کو تمہارے مذہب کے تابع ہونا چاہیے، تو جان لو کہ تم بہت بڑی ہلاکت اور اندھیروں کے گڑھے میں پڑ گئے ہو، اور اللہ کی پناہ چاہیے اس سے۔"

"لیکن اگر تم یہ عقیدہ رکھتے ہو کہ تمہارے امام کا مذہب دلائل کے تابع ہے، تو تم خیرِ عظیم پر ہو۔"

"پس اگر تمہیں، اے کامیاب ہونے والے! کوئی دلیل اپنے مذہب کے خلاف نظر آئے تو واجب یہ ہے کہ تم اپنے مذہب کو چھوڑ دو اور دلیل کی پیروی کرو۔"

"اور میرا خیال ہے کہ یہ قاعدہ اب بالکل واضح ہے، کیونکہ ہم نے اس پر بہت زیادہ بات کر لی ہے اور بار بار سمجھایا ہے۔"

"اور قواعد میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ صحیح نقل (یعنی قرآن و سنت کی صحیح نصوص) عقل پر مقدم ہیں۔ صحیح نقل عقل پر مقدم ہے۔"

"لہٰذا تمہارے لیے یہ جائز نہیں کہ نصوص کو اپنی عقل کے ساتھ ٹکراؤ۔ خبردار رہو! جب بھی تمہیں لگے کہ تمہاری عقل کسی نص کے خلاف جا رہی ہے تو اپنی عقل پر شک کرو اور نص کو اسی طرح باقی رکھو جیسا ہے۔"

"اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کافروں پر عیب لگایا جب رسول ﷺ نے ان سے کہا: 'اللہ نے جو تمہیں رزق دیا ہے، اس میں سے خرچ کرو' تو انہوں نے صاف اور صحیح نص کے مقابلے میں اپنی عقل پیش کی اور کہنے لگے: 'کیا ہم اس کو کھلائیں جسے اگر اللہ چاہتا تو خود کھلا دیتا؟ تم تو کھلی گمراہی میں ہو۔' یہ دراصل عقل کو نص پر مقدم کرنے کی مثال ہے۔"

"اور اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو جنت سے نکال باہر کیا، اس لیے کہ اس نے نص کی مخالفت کی۔ جب اللہ نے فرمایا: 'آدم کو سجدہ کرو' تو اس نے اپنی خالی عقل سے معارضہ کیا اور کہا: 'میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹی سے پیدا کیا ہے۔" '

"اگر تم سب رسولوں کی مخالفت کرنے والوں کے حالات پر غور کرو گے تو دیکھو گے کہ ان کی مخالفت کے پیچھے ہمیشہ عقل کو معیار بنانا ہوتا ہے۔ تمام وہ لوگ جو رسولوں کی مخالفت کرتے ہیں، ان کی مخالفت کے پیچھے یہی عقلی فیصلے ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: 'اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس (کتاب) کی پیروی کرو جو اللہ نے نازل کی ہے، تو وہ کہتے ہیں: ہم تو اسی کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔' چاہے ان کے باپ دادا کچھ بھی عقل نہ رکھتے ہوں اور نہ ہی ہدایت پر ہوں۔ یعنی جب تمہارے باپ دادا عقل مند ہی نہیں تھے تو تم بھی ان جیسے بے عقل کیوں بنو؟ جب نص آجائے تو خبردار رہو کہ اسے اپنی عقل کے مقابلے میں نہ لا کھڑا کرو۔"

"لیکن ہمارے دور میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم کسی ایسے نص کو قبول ہی نہیں کریں گے جو عقل کے خلاف ہو۔ اس طرح انہوں نے نص کو تولے جانے والی چیز اور عقل کو ترازو بنا لیا۔ چنانچہ جو چیز ان کی عقل سے موافق ہو گئی اسے لے لیا اور قبول کر لیا، اور جو چیز ان کی عقل سے نہ ملی یا ٹکرائی تو اسے رد کر دیا اور اس پر الزام دھرا۔"

"یہی فلسفی ہیں، جیسے جہمّیہ، معتزلہ اور اشاعرہ۔ بلکہ ان میں سے بعض نے تو عقل کی ایسی قدر بڑھا دی کہ اسے اللہ تعالیٰ کے ساتھ حاکم اور شریعت بنانے والا بنا دیا، جیسے معتزلہ۔ پس جو بھی سیدھے راستے سے بھٹک گیا، اس کے پیچھے ایک عقلی معارضہ ہی کارفرما تھا۔"

"اسی لیے اہلِ سنت والجماعت رحمہم اللہ نے اس باب میں ایک نہایت فائدہ مند قاعدہ طے کیا ہے۔ وہ یہ کہ: صحیح نقل اور صریح عقل کبھی باہم متعارض نہیں ہوتے۔ صحیح نقل اور صریح عقل میں کبھی تعارض نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ جس نے عقل کو پیدا کیا ہے، اسی نے نص کو نازل کیا ہے، اور وہی اپنی مخلوق سے زیادہ جاننے والا ہے، اور وہ سب سے اچھا کہنے والا اور سب سے سچا بات کرنے والا ہے۔"

"پس اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ عقل کے ساتھ کیا ٹکرائے گا اور کیا نہیں ٹکرائے گا۔ نصوص کبھی ایسا کچھ لے آتی ہیں جو عقل کو حیران کر دے، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ وہ عقل کے خلاف ہوں۔"

"اسی پر اہلِ سنت نے بہت سے فروع قائم کیے ہیں۔ ان میں سے کچھ مثال کے طور پر ہم یہاں ذکر کریں گے۔ ان میں سے ایک یہ کہ غیب کے جو ابواب نصوص سے ثابت ہیں، انہیں کبھی اپنی عقل کے سامنے نہ رکھو۔"

کیونکہ تمہاری عقل اس بات سے عاجز ہے کہ وہ ان غیبی امور کو سمجھ سکے۔

اور جتنے بھی لوگوں نے غیبی امور کا انکار کیا ہے تو انہوں نے اس لیے کیا کہ انہوں نے اسے اپنی عقل پر قیاس کیا۔ حالانکہ عقل اتنی کمزور، عاجز اور حقیر ہے کہ وہ ان غیبی امور کو درک ہی نہیں کر سکتی۔اسی لیے جنہوں نے قبر کے عذاب اور قبر کے نعیم (سکون و راحت) کا انکار کیا، انکار کس بنیاد پر کیا؟ کہا: ہم کافر کی قبر کھولتے ہیں تو ہمیں کوئی عذاب نظر نہیں آتا۔

یعنی وہ اپنی عقل کے ذریعے قبر کے عذاب کو دریافت کرنا چاہتے تھے۔

اسی طرح انہوں نے اللہ تعالیٰ کی صفات کا بھی انکار کیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ بھی غیبی امور ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کو اپنی عقل پر پیش کریں۔ چنانچہ انہوں نے اللہ کے اسماء و صفات کے بارے میں نصوص کو اپنی عقل کے ساتھ ٹکرایا اور اپنی عقل کو نصوص پر مقدم کر دیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے استواء (عرش پر بلند ہونا) کا انکار کر دیا۔ کیوں انکار کیا؟ کہا: کیونکہ استواء کا مطلب

ہے کہ رب کو عرش کی حاجت ہے، حالانکہ اللہ کو عرش کی حاجت نہیں۔ اور یہ کہ اگر ہم عرش کو ہٹا دیں تو گویا اللہ گر جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس قول سے بہت بلند ہے، بہت بلند ہے۔

پس اے مسلمان! خبردار! تو اپنے عقل کو غیبی امور میں نہ گھسا۔ اور اس قاعدے کو لازم پکڑ لو: "غیب میں عقل کا کوئی دخل نہیں۔" غیبی معاملات میں عقل کو دخل دینا جائز نہیں۔ کیونکہ غیبی مسائل میں گمراہی کے سب سے بڑے اسباب میں سے ایک یہ رہا ہے کہ لوگوں نے ان کو اپنی عقل سے پرکھنے کی کوشش کی، تو وہ خود گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔

اے شیخ فہد! دوسرا فرع (شق) یہ ہے کہ دلیل کی حکمت کا چھپ جانا (ہم پر واضح نہ ہونا) اس پر عمل کرنے کی شرط نہیں ہے۔

یعنی دلیل کی حکمت ہم پر چھپی رہے، تب بھی اس پر عمل واجب ہے۔

کیونکہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو بعض احادیث پر عمل کو اس وقت تک روکے رکھتے ہیں جب تک ان کی حکمت نہ سمجھ لیں۔ مثال کے طور پر ہم اس سے کہیں: اونٹ کے گوشت کھانے کے بعد وضو کرو۔ تو وہ کہے گا: اس کی کیا حکمت ہے؟ مجھے حکمت بتاؤ، میرا عقل مطمئن کرو، مجھے قائل کرو۔ ایسے موقع پر یہ قاعدہ سامنے آتا ہے جو دراصل ایک فرع ہے ایک بڑی اصل قاعدے کی۔ اور وہ یہ ہے کہ دلائل پر عمل کرنا کسی علت یا حکمت کے سمجھنے پر موقوف نہیں۔

پس تم پر واجب ہے کہ شریعت پر عمل کرو صرف اس لیے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہے، بس! یہی علت ہے اور یہی حکمت ہے جس پر مسلمان کو ٹھہر جانا چاہیے۔

اگر تم سے کہا جائے: تم نے عصر کی نماز چار رکعت کیوں پڑھی؟

تو جواب دو: اس لیے کہ اللہ نے مجھے ایسا حکم دیا ہے۔

لیکن تمہاری عقل کو چیلنج ہے کہ وہ اس کی علت بتا سکے۔

کیوں شریعت نے عصر کی نماز چار رکعت رکھی، پھر دو تین گھنٹے بعد مغرب کی نماز آئی تو وہ تین رکعت ہے، پھر عشاء آئی تو وہ چار رکعت ہے، اور فجر آئی تو وہ دو رکعت ہے، کیوں؟ کیوں؟

اس کی علت کیا ہے اے شیخ سید؟

جواب یہی ہے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہے۔ اسی وجہ سے مجھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا حضرت معاذہ کو دیا گیا جواب بہت پسند ہے۔

معاذہ نے ان سے پوچھا: حیض والی عورت روزے کی قضا کیوں دیتی ہے لیکن نماز کی قضا کیوں نہیں دیتی؟

حضرت عائشہ نے کہا: کیا تم حروریہ (خوارج) میں سے ہو؟

میں نے کہا: نہیں، میں حروریہ میں سے نہیں ہوں، لیکن صرف سوال کر رہی ہوں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: یہ حالت ہمیں نبی ﷺ کے زمانے میں بھی پیش آتی تھی۔

تو ہمیں حکم دیا جاتا تھا کہ روزے کی قضا کریں، لیکن نماز کی قضا کرنے کا حکم نہیں دیا جاتا تھا۔

پس خبردار رہو کہ نصوص (احادیث یا دلائلِ شرعیہ) کے قبول کرنے کا معیار یہ نہ بناؤ کہ ان کی حکمت یا علت تمہیں معلوم ہو۔

جب نص صحیح ثابت ہو گیا تو اس پر عمل کرنا تم پر واجب ہے۔اور یہی وہ چیز ہے جس کے ذریعے ہم اللہ عزوجل کی بندگی بجا لاتے ہیں۔

قاعدة :لا يجوز معارضة صحيح المنقول بضعيفه.

اور اصولوں میں سے ایک عظیم اصول یہ بھی ہے کہ صحیح منقول (حدیث) کو ضعیف کے ساتھ معارضہ کرنا جائز نہیں۔

پس جب بھی احکام صحیح اور صریح احادیث سے ثابت ہو جائیں تو ہمارے لیے جائز نہیں کہ ہم ان کی دلالت میں شک کریں یا ان کی دلالت کو کسی ضعیف حدیث کے ذریعے معارض کریں۔ کیونکہ دلیل کی تعظیم یہ ہے کہ اس کو ضعیف احادیث کے ساتھ نہ ٹکرایا جائے، لہٰذا ضعیف حدیث کو اس کے مقابل میں نہ رکھو۔ اور کتنے ہی فقہاء نے صحیح احادیث کا معارضہ ضعیف احادیث کے ساتھ کیا ہے، اور یہ بات درستگی سے ہٹی ہوئی ہے، اور صحیح علمی راستے سے انحراف ہے۔

پس اے طالب علم! جب بھی تم دیکھو کہ کوئی حکم صحیح دلیل سے ثابت ہے اور اس کے مقابل میں کوئی ضعیف حدیث پیش کی جارہی ہے، تو ضعیف حدیث کو چھوڑ دو اور صحیح پر عمل کرو۔

اب ہم اس قاعدے پر کچھ عملی مثالیں بیان کرتے ہیں:

صحیحین میں نبی ﷺ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ تم میں سے کسی کی نماز قبول نہیں کرتا جب وہ حدث کرے یہاں تک کہ وضو کرے۔ سمجھ گئے اے جماعت؟ اللہ تعالیٰ تم میں سے کسی کی نماز قبول نہیں کرتا جب وہ حدث کرے یہاں تک کہ وضو کرے۔اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: بغیر وضو کے نماز قبول نہیں ہوتی، اور خیانت میں دی گئی صدقہ قبول نہیں ہوتا۔ یہ صحیح حدیث ہے۔اور علی بن طلق رضی اللہ عنہ سے حدیث ہے جسے ابو داود نے روایت کیا ہے اور اس کی سند دوسرے طرق کی وجہ سے صحیح ہے۔ وہ کہتے ہیں: اگر تم میں سے کوئی نماز کے دوران پاد دے تو وہ نکل جائے، وضو کرے اور اپنی نماز دوبارہ ادا کرے۔ ۔۔ یہ سب صحیح احادیث ہیں جو اس پر دلالت کرتی ہیں کہ حدث نماز کو فاسد اور باطل کر دیتا ہے۔ ۔۔۔ ٹھیک ہے؟

کچھ علماء کی ایک جماعت نے ان صحیح احادیث کا معارضہ کیا۔ کاش کہ وہ صحیح احادیث سے معارضہ کرتے، مگر انہوں نے ایک ضعیف حدیث سے معارضہ کیا۔ وہ ہے عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت جو ابن ماجہ نے بہت ہی ضعیف سند سے نقل کی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جو شخص نماز میں ہو اور اسے قے، یا ناک سے خون، یا ڈکار (قلس)، یا مذی نکل آئے، تو وہ باہر جائے، وضو کرے پھر اپنی نماز پر بنا کرے، اور اس دوران بات نہ کرے۔

یعنی تم نماز میں ہو اور اگر تمہیں دوسری رکعت میں حدث ہو جائے تو باہر نکلو، وضو کرو، بات نہ کرو اور پھر تیسری اور چوتھی رکعت مکمل کر لو۔

اب کیا یہ صحیح اور صریح احادیث جو حدث کے ساتھ نماز کے باطل ہونے اور دوبارہ شروع کرنے پر دلالت کرتی ہیں، اس طرح کی ضعیف روایت کے ساتھ ٹکرائی جا سکتی ہیں؟ یہ طریقہ درست نہیں ہے، یہ خطا ہے۔ پس صحیح دلائل کی تعظیم یہی ہے کہ ان کو ضعیف کے ساتھ معارض نہ کیا جائے۔

ایک اور مثال:صحیح دلیل اس پر دلالت کرتی ہے کہ عورت، کالا کتا اور گدھا نماز کو کاٹ دیتے ہیں۔ صحیح مسلم میں ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: مسلمان کی نماز کو کاٹ دیتا ہے اگر اس کے سامنے کجاوے

کے پچھلے حصے کے برابر کوئی چیز نہ ہو، عورت اور گدھا اور کالا کتا۔ یہ نص قاطع ہے، صحیح مسلم میں۔اور صحیح مسلم ہی میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: نماز کو کاٹتے ہیں عورت، گدھا اور کتا۔ یہاں مطلق ذکر کیا گیا اور کالا نہیں کہا گیا۔ لیکن چونکہ مطلق کو مقید پر محمول کیا جاتا ہے اس لیے ہم کہتے ہیں کہ صرف کالا کتا ہی نماز کو کاٹتا ہے۔ یہ سب صحیح اور صریح احادیث ہیں اپنے مدلول میں، ہیں یا نہیں؟

اچھا، کچھ علماء نے کہا: اصل میں کچھ بھی نماز کو نہیں کاٹتا۔

تم نے ان صحیح احادیث کی مخالفت کس چیز سے کیا؟ انہوں نے کہا: اس سے جو ابو داود نے اپنی سنن میں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ نبی ﷺ نے فرمایا: نماز کو کوئی چیز نہیں کاٹتی۔

ہم نے ان سے کہا: اے جماعت! یہ حدیث ضعیف ہے۔ پھر تم کس طرح اس کے ساتھ صحیح احادیث اور دلائل کی مخالفت کرتے ہو؟ اپنے اوپر اللہ سے ڈرو۔ یہ صحیح دلیل کی تعظیم نہیں ہے۔ صحیح دلیل کی تعظیم یہ ہے کہ طالب علم صحیح احادیث کی دلالت پر قائم رہے اور اس ضعیف حدیث کو حجت کے دائرے سے باہر نکال دے۔

ایک تیسری مثال: صحیح اور صریح حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ موزوں پر مسح کرنا ایک عبادت ہے جو مدت کے ساتھ مقید ہے: مقیم کے لیے ایک دن اور ایک رات، اور مسافر کے لیے تین دن اور تین راتیں۔(اے شیخ سید! تین دن اور تین راتیں۔ کیا ایسا نہیں ہے؟) یہ بات بالکل واضح ہے۔

کہاں ہیں صحیح نصوص؟ بہت زیادہ ہیں۔ صحیح مسلم میں علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: مسافر کے لیے تین دن اور تین راتیں اور مقیم کے لیے ایک دن اور ایک رات (مسح کا وقت ہے)۔ اور ابن ماجہ میں ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح روایت ہے اور امام ابن خزیمہ نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ اور خزیمہ بن ثابت کی روایت بھی بیہقی میں آئی ہے، وہ بھی اسی طرح ہے۔ یہ سب احادیث صحیح اور واضح ہیں، مدت کے تعین میں کسی قسم کا اشکال نہیں۔ لیکن اس کے برخلاف ایک اور روایت پیش کی گئی کہ اُبی بن عمارۃ نے کہا: یا رسول اللہ! کیا میں موزوں پر مسح کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔ اُس نے پوچھا: ایک دن؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔ اُس نے کہا: دو دن؟ فرمایا: ہاں۔ اُس نے کہا: تین دن؟ فرمایا: ہاں۔ یہاں تک کہ جتنے چاہو۔ ہم نے کہا:

بھائیو! اللہ سے ڈرو! یہ روایت ضعیف ہے، تم کس طرح ان صحیح احادیث کے مقابلے میں اسے پیش کرتے ہو؟ یہ کبھی درست نہیں ہو سکتا۔

اور یہی چیز فقہ میں بہت نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر حنابلہ کے ہاں یہ مشہور ہے کہ زوال کے بعد روزے کی حالت میں مسواک کرنا مکروہ ہے۔ روزہ دارو! آج اگر ہم تمہارے ساتھ ظہر کی نماز پڑھیں یا سورج ڈھل جائے تو تم مسواک نہ کرنا، حنابلہ کے نزدیک یہ مکروہ ہے۔ ان کا ثبوت کیا ہے؟ وہ علی رضی اللہ عنہ کی روایت پیش کرتے ہیں: ''جب تم روزہ رکھو تو صبح کے وقت مسواک کرو اور شام کو مسواک نہ کرو۔'' اور شام کا مطلب ہے زوال کے بعد کا وقت۔ ہم نے کہا: بھائیو! یہ روایت ضعیف ہے، بلکہ بعض اہل علم نے کہا کہ یہ باطل ہے۔ تم اسے کس طرح ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی صحیح روایت کے مقابلے میں لاتے ہو؟ نبی ﷺ نے فرمایا: ''اگر میری امت پر مشقت نہ ہوتی تو میں انہیں ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا۔'' اور ایک روایت میں ہے: ''میں نے تم پر مسواک کے بارے میں زیادہ زور دیا ہے۔'' اور ایک اور حدیث ابوسلمہ سے زید بن خالد رضی اللہ عنہ سے ہے: ''میں انہیں ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا۔'' یہ عام احادیث ہیں جن میں روزہ دار اور غیر روزہ دار سب داخل ہیں۔ تو پھر کس طرح ایک ساقط السند روایت کو ان کے مقابلے میں لایا جا سکتا ہے؟ یہ کبھی جائز نہیں۔ واللہ اعلم۔

اور اصولوں میں سے ایک اور اصول یہ بھی ہے کہ صحیح نقل کو حقیقتِ واقعہ کے ساتھ ٹکرانا جائز نہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بہت سی دلیلوں کو یہ کہہ کر رد کر دیتا ہے کہ یہ دلیلیں حقیقت کے خلاف ہیں۔ حالانکہ یہ بات تمام علما کے نزدیک متفقہ طور پر حرام اور ممنوع ہے۔ ہمارے لیے لازم ہے کہ نصوص کے بارے میں تسلیم کریں، ان کے معنی کو سچ مانیں، یہ عقیدہ رکھیں کہ وہی حق ہیں اور ان سے بڑھ کر کوئی حق نہیں، اور یہ یقین رکھیں کہ وہی صدق ہیں اور ان سے بڑھ کر کوئی صدق نہیں۔ اس مقام پر ہمیں یہ عقیدہ رکھنا واجب ہے کہ کوئی بھی صحیح نص ایسی نہیں ہو سکتی جو حقیقت کے خلاف ہو۔ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں اور مباہلہ کرتا ہوں اور اللہ کی قسم دس مرتبہ کھا کر کہتا ہوں کہ کوئی صحیح نص ایسی نہیں ہے جو کسی حقیقت کے بارے میں ہو اور حقیقت اس کے خلاف ثابت ہو۔ میں تمہیں چیلنج کرتا ہوں، یہ کبھی ممکن ہی نہیں۔

اس لیے جو بھی یہ اعتراض کرے کہ فلاں صحیح حدیث یا بخاری کی روایت فلاں حقیقت کے خلاف ہے تو میں ہمیشہ دو جواب دیتا ہوں۔

پہلا جواب یہ ہوتا ہے کہ یہ نص سرے سے صحیح ہی نہیں۔ یعنی ممکن ہے کہ وہ موضوع یا جھوٹی روایت ہو۔(یعنی وہ اس روایت کی صحیح بخاری کی طرف جھوٹی نسبت کرتا ہو) اگر میں اور وہ شخص اس پر متفق ہو جائیں کہ یہ نص واقعی صحیح ہے تو پھر میں دوسرا جواب دیتا ہوں۔

دوسرا جواب یہ ہوتا ہے کہ تمہاری نص کو سمجھنے میں غلطی ہے۔ نص حقیقت کے بارے میں بات کرتی ہے لیکن وہ حقیقت وہ نہیں جو تم اپنے فہم میں سمجھ بیٹھے ہو۔ بلکہ وہ کسی اور حقیقت کے بارے میں ہے جس کا تمہیں پورا علم نہیں۔ تم موجودہ زمانے کی حقیقت کو دیکھتے ہو مگر مستقبل کی حقیقت سے بے خبر ہو سکتے ہو۔ ممکن ہے کہ یہ نص کسی اور حقیقت پر دلالت کرتی ہو نہ کہ اس پر جو تم نے سمجھ لیا ہے۔ اس لیے کبھی بھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ نص حقیقت کے خلاف ثابت ہو۔

تیسرا جواب بھی ہے، اگرچہ یہ تحریر میں درج نہیں۔ وہ یہ کہ بعض لوگ حقیقت ہی کو صحیح طور پر نہیں سمجھتے۔ تو ان کے اندر دو آفات ہو جاتی ہیں: یا تو نص کو نہیں سمجھتے یا حقیقت کو ہی نہیں پہچانتے۔ پس وہ ان دو میں سے کسی ایک گڑھے میں گر جاتے ہیں۔

لوگ کہتے ہیں: اچھا، ہم تمہارے سامنے کچھ مثالیں پیش کرتے ہیں جو حقیقت کے خلاف معلوم ہوتی ہیں اور پھر تمہارا جواب سنتے ہیں۔ میں کہتا ہوں: میں تمہیں چیلنج کرتا ہوں۔ کیا تم بھی میرے ساتھ ان کا مقابلہ کرتے ہو؟ ضرور۔ اگر جواب معلوم نہ بھی ہو تو اے اہلِ سنت! گھبراؤ نہیں، کہہ دو کہ میں تحقیق کروں گا۔ لیکن یہ یقین رکھو کہ کبھی بھی حقیقت کے خلاف کوئی صحیح نص نہیں ہو سکتی۔

پھر وہ کہتے ہیں: اچھا، ایک ایسی آیت دکھاتے ہیں جس کا تمہارے پاس جواب نہیں ہوگا اور وہ حقیقت کے خلاف ہے۔ قرآن میں ہے کہ جو بیت اللہ میں داخل ہوا وہ امن پا گیا۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ جو بھی بیت اللہ یا حدودِ حرم میں داخل ہو، وہ امن میں ہوگا۔ اب لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اہلِ حرم کو خوف لاحق ہوتا ہے، وہ اپنی جان، مال اور گاڑیوں کے بارے میں ڈرتے ہیں، چوروں اور لٹیروں سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ تو پھر اللہ نے کیسے کہہ

دیا کہ جو حرم میں داخل ہو وہ امن میں ہوگا، جبکہ حقیقت میں تو خوف موجود ہے؟ یہ تو حقیقت کے خلاف ہوا۔

اب اس کا جواب یہ ہے کہ تم نے آیت کو غلط سمجھا ہے۔ تم نے یہ گمان کر لیا کہ یہاں امن سے مراد اللہ کی وہ کونی ارادہ ہے جو لازماً وقوع پذیر ہوتا ہے۔ یعنی تم نے سمجھا کہ اللہ خبر دے رہا ہے کہ جو بھی حرم میں داخل ہوگا، وہ لازماً امن میں ہوگا۔ حالانکہ اگر اللہ کونی ارادہ سے یہ چاہ لیتے تو اہل حرم کو کبھی بھی خوف لاحق نہ ہوتا۔ بلکہ اگر وہ چاہ لیتے تو پوری زمین کے لوگ ہمیشہ امن میں ہوتے۔ اللہ کی کونی ارادہ وہی ہے جو ضرور واقع ہوتی ہے۔

پھر اصل معنی یہ ہے کہ جو بھی حرم میں داخل ہو، تم پر لازم ہے کہ اسے امن دو۔ یہ ایک شرعی حکم ہے، کونی ارادہ نہیں۔ اور شرعی حکم ایسا ہوتا ہے کہ کبھی لوگ اس پر عمل کرتے ہیں اور کبھی نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر، اگر کہا جائے کہ مومن نماز پڑھتا ہے، تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مومن لازماً نماز پڑھتا ہے؟ نہیں، بلکہ یہ حکم ہے کہ مومن کو نماز پڑھنی چاہیے۔ اسی طرح اللہ نے فرمایا کہ جو حرم میں داخل ہو اسے امن دو، یعنی یہ تم پر فرض ہے۔ لیکن کیا لوگوں نے اللہ کے اس حکم پر عمل کیا؟ نہیں۔ جیسے انہوں نے اس کے دوسرے احکام جیسے نماز اور اسلام کے تقاضے پر بھی عمل نہیں کیا۔

پس معلوم ہوا کہ اہل حرم کو امن دینا شرعی حکم ہے، کونی ارادہ نہیں۔ اس لیے اصل غلطی ان لوگوں کی ہے جنہوں نے نص کو غلط سمجھا۔ اب سنو ایک اور آیت﴿لَتَدْخُلُنَّ ٱلْمَسْجِدَ ٱلْحَرَامَ إِن شَآءَ ٱللَّهُ ءَامِنِينَ مُحَلِّقِينَ رُءُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ لَا تَخَافُونَ﴾ (الفتح: 27)

تم لازماً مسجد حرام میں داخل ہوگے، اگر اللہ نے چاہا، امن کے ساتھ، اپنے سروں کو منڈواتے اور بال کٹواتے۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ نبی ﷺ اور آپ کے صحابہ حرم میں داخل ہوں گے۔ اور تم جانتے ہو کہ یہ آیت صلح حدیبیہ کے موقع پر نازل ہوئی تھی، یعنی عمرہ حدیبیہ سے پہلے۔ اب میں تم سے اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں: کیا عمرہ حدیبیہ میں رسول اللہ ﷺ حرم میں داخل ہوئے تھے؟ کیا صحابہ داخل ہوئے تھے؟ جواب ہے: نہیں۔

تو وہ کہتے ہیں: یہ آیت حقیقت کے خلاف ہے۔ کیونکہ آیت تو یہ کہتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ حرم میں داخل ہوں گے، نسک مکمل کریں گے، طواف کریں گے، سعی کریں گے اور بال کٹوائیں گے یا منڈوائیں گے۔ لیکن ایسا

تو نہیں ہوا۔ رسول اللہ ﷺ حرم میں داخل نہ ہوئے، نہ طواف کیا نہ سعی۔ تو کیسے کہتے ہو کہ نص حقیقت کے خلاف نہیں ہوتی؟

اب اصل وجہ کہاں ہے؟ اصل وجہ تمہارے فہم کی غلطی ہے۔ میں تمہیں اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں: کیا نص نے وقت کی قید لگائی تھی؟ کیا اس نے کہا تھا کہ یہ سب عمرہ حدیبیہ میں ہوگا یا اس سال ہی ہوگا؟ نہیں۔ نص نے صرف یہ بات یقینی طور پر بتائی تھی کہ تم داخل ہوگے۔ لیکن کیا یہ کہا تھا کہ اسی سال داخل ہوگے یا اگلے سال یا اس کے بعد والے سال؟ نص تو ایک ربانی وعدہ تھا کہ یہ ضرور ہوگا۔ لیکن وقت متعین نہیں کیا گیا۔ تو جب دلیل مطلق تھی تو تم نے اسے اپنے طور پر ایک سال کے ساتھ مقید کر دیا اور پھر کہا کہ یہ حقیقت کے خلاف ہے۔ حقیقت میں یہ تمہارے سمجھنے کی غلطی ہے کہ تم نے مطلق کو مقید کر لیا۔ اس لیے تضاد پیدا ہوا، ورنہ حقیقت میں کوئی تعارض نہیں۔

اسی وجہ سے عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا تھا جب قریش نے انہیں روک دیا تھا: یا رسول اللہ! کیا آپ نے ہمیں یہ خبر نہیں دی تھی کہ ہم حرم آئیں گے، طواف کریں گے اور سعی کریں گے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا میں نے کہا تھا کہ یہ اسی سال ہوگا؟ میں نے تو صرف کہا تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔ تم آؤ گے ہی، داخل ہوگے ہی، طواف کرو گے ہی، بال کٹواؤ گے ہی۔ لیکن یہ سمجھنا کہ اسی سفر میں یا اسی سال ہوگا، یہ غلطی ہے۔ کس نے کہا کہ میں نے ایسا کہا ہے؟

تو نتیجہ یہ ہوا کہ نص اور حقیقت میں مطابقت ہے۔ بعد میں جب مکہ فتح ہوا تو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ امن کے ساتھ حرم میں داخل ہوئے، طواف کیا، سعی کی، بال کٹوائے اور منڈوائے۔ یوں یہ آیت بالکل صحیح ثابت ہوئی۔

اب ایک اور حدیث سنو جس پر لوگ اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ حقیقت کے خلاف ہے۔ اگر میں فلو (انفلوئنزا) میں مبتلا ہوں اور تندرست لوگوں کے درمیان بیٹھوں تو ان کے ساتھ کیا ہوگا؟ بتاؤ بھائیو، انہیں بیماری لگے گی۔ تو اس کا مطلب ہے کہ متعدی بیماری موجود ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ بیماری پھیلتی ہے۔ لیکن پھر ہمیں نبی ﷺ کی حدیث ملتی ہے جس میں فرمایا گیا: ''بیماری متعدی نہیں ہوتی''۔ تو وہ کہتے ہیں کہ یہ بات حقیقت کے خلاف ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ نص حقیقت کے خلاف نہیں ہے۔ نبی ﷺ نے جو کہا کہ بیماری متعدی نہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ بیماری کا پہلا مریض کس کے سبب

بیمار ہوا؟ یعنی وہ پہلا شخص جسے بیماری لاحق ہوئی، اسے کس نے بیمار کیا؟ کوئی انسان نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے براہِ راست اسے بیمار کیا۔ تو نبی ﷺ کی حدیث کا مقصد ابتدائی بیماری کو بیان کرنا ہے، نہ کہ بیماری کے پھیلنے (منتقل ہونے) کو۔

جہاں تک حقیقت ہے، وہ یہ ہے کہ بیماری آگے منتقل ہوتی ہے۔ لیکن سب سے پہلے بیماری اللہ تعالیٰ کے حکم اور تقدیر سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے اصل میں نبی ﷺ اہلِ جاہلیت کے اس عقیدے کو باطل کر رہے تھے کہ بیماری اپنی ذات سے لازماً پھیلتی ہے بغیر تقدیرِ الٰہی کے۔

اسی لیے جب ایک صحابی نے یہ بات سنی تو کہا: یا رسول اللہ! ہم دیکھتے ہیں کہ ایک اونٹ کے ہونٹ پر ایک کیڑا لگتا ہے تو وہ اونٹ خارش میں مبتلا ہو جاتا ہے، اور پھر یہ بیماری دوسرے اونٹوں میں بھی پھیل جاتی ہے۔ تو نبی ﷺ نے فرمایا: پہلے اونٹ کو کس نے بیمار کیا؟ وہاں تو کوئی بیمار اونٹ موجود نہیں تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے پہلے اونٹ کو اپنی تقدیر سے بیمار کیا، ویسے ہی وہ دوسروں کو بھی اپنی تقدیر سے بیمار کرتا ہے۔ اسی لیے بعض دفعہ انسان بغیر کسی مریض کے رابطے میں آئے بیمار ہو جاتا ہے۔ اور کبھی کوئی شخص کئی مریضوں کے درمیان رہتا ہے اور پھر بھی بالکل صحیح سلامت نکل آتا ہے۔ اس لیے نتیجہ یہ ہے کہ بیماری بذاتِ خود پھیلنے والی نہیں بلکہ یہ سب کچھ اللہ کے حکم اور تقدیر سے ہوتا ہے۔

اب سنو ایک اور حدیث۔ نبی ﷺ نے فرمایا: اگر بنی اسرائیل نہ ہوتے تو گوشت کبھی خراب نہ ہوتا۔ یعنی اگر بنی اسرائیل نہ ہوتے تو گوشت کبھی نہیں سڑتا۔ اب لوگ کہتے ہیں: اس کا بنی اسرائیل سے کیا تعلق؟ گوشت کا خراب ہونا تو ایک طبعی، کیمیائی اور ماحولیاتی عمل ہے۔ اگر گوشت جمع کر دیا جائے اور ہوا نہ لگے تو وہ خود بخود گلنے سڑنے لگتا ہے۔ تو بنی اسرائیل کا اس میں کیا کردار؟

اب دیکھو، تم اپنی فریج میں گوشت رکھ دو اور بجلی چلی جائے، تین دن بعد وہ خراب ہو جائے گا۔ اس میں بنی اسرائیل کا کیا دخل؟ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ حدیث عقل کے خلاف ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت تک جو بھی گوشت خراب ہوگا، اس کا سبب بنی اسرائیل ہیں؟

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ حدیث کا مطلب بہت واضح ہے۔ حدیث یہ نہیں کہتی کہ گوشت کی طبیعی خرابی کا سبب بنی اسرائیل ہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ گوشت کا

خراب ہونا اصل میں اس وقت ہوا جب بنی اسرائیل نے اللہ کی نافرمانی کی، ورنہ پہلے زمانے میں گوشت ایسے خراب نہیں ہوتا تھا۔ یہ ان کی گناہ گاری کے نتیجے میں اللہ کی طرف سے ایک سزا تھی۔ پس یہ حدیث بھی حقیقت کے خلاف نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت کے ساتھ بالکل مطابقت رکھتی ہے، بشرطیکہ اسے درست طور پر سمجھا جائے۔

خصوصاً جب گوشت ایسی جگہ ذخیرہ کیا جائے جو ذخیرہ کرنے کے لیے مناسب نہ ہو۔ لیکن آج ہماری فریجوں میں اگر گوشت کئی دن تک بھی رکھا رہے تو وہ خراب نہیں ہوتا، کیونکہ وہ جگہ خاص طور پر گوشت محفوظ کرنے کے لیے بنائی گئی ہے۔

سنو! بنی اسرائیل سے پہلے لوگ گوشت کو ذخیرہ نہیں کرتے تھے۔ بلکہ وہ اسے کھلی ہوا میں رکھتے اور کچھ چیزیں لگا دیتے تھے جو اس کے سڑنے کو دیر سے لاتی تھیں۔ لیکن جب اللہ نے بنی اسرائیل پر من و سلویٰ اتارا، تو انہوں نے گوشت اپنے گھروں میں جمع کرنا شروع کر دیا۔ پس سب سے پہلے گوشت جمع کرنے اور محفوظ کرنے کا طریقہ کس نے ایجاد کیا؟ بنی اسرائیل نے۔

چنانچہ جب وہ گوشت جمع کرنے لگے تو گوشت خراب ہونے لگا۔ پھر یہ بری عادت ان کے بعد آنے والی امتوں میں بھی پھیل گئی۔ یوں وہ ایک بری سنت جاری کرنے والے بنے، اور جس نے کوئی بری سنت ایجاد کی اس پر اس کا بوجھ بھی ہے اور اس پر عمل کرنے والوں کا بوجھ بھی۔ بنی اسرائیل سے پہلے قومیں گوشت جمع کر کے محفوظ کرنے کو جانتی ہی نہ تھیں۔

اگر تم سمجھ نہ پا رہے ہو تو ایک قریب تر مثال سنو: کیا قوم لوط سے پہلے دنیا کی قومیں لڑکوں کے ساتھ بدفعلی کو جانتی تھیں؟ نہیں۔ قوم عاد، قوم ہود، قوم ابراہیم— ان میں کوئی اس کو جانتا ہی نہ تھا۔ یہ بدکاری سب سے پہلے قوم لوط میں ظاہر ہوئی۔ پھر زمین پر پھیل گئی۔ تو قیامت تک اگر کوئی اس گناہ کا ارتکاب کرے گا تو اس کا ایک حصہ قوم لوط کے سر جائے گا، کیونکہ وہ پہلے لوگ تھے جنہوں نے اس جرم کو دنیا میں جاری کیا۔ بالکل اسی طرح سب سے پہلے گوشت جمع کر کے محفوظ کرنے کا طریقہ بنی اسرائیل نے ایجاد کیا۔ پس وہی اصل سبب ہیں گوشت کے خراب ہونے کے۔ اگر وہ لوگ انسانوں کو کھلی ہوا کے ماحول پر چھوڑ دیتے تو اللہ کی قسم! گوشت کئی دن تک بھی خراب نہ ہوتا۔

میں خود یاد کرتا ہوں کہ میں نے اپنے والدین کو اس حالت میں پایا کہ جب وہ بیابان میں کئی دن کے سفر پر ہوتے، تو ذبح کرتے اور گوشت پر نمک مل دیتے جسے وہ " الکفر" کہتے تھے۔ پھر گوشت کئی دن تک ٹھیک رہتا۔ صرف اس کی بیرونی سطح خشک ہو جاتی تھی، لیکن جب اسے کاٹتے تو اندر کا گوشت نرم اور تازہ ہوتا۔ اس طرح بیکٹیریا کے اثر سے وہ بچا رہتا تھا۔ لیکن اگر فریج ایک دو گھنٹے یا ایک دن بھی بند ہو جائے، یا برف پگھل جائے، تو فوراً گوشت خراب ہو جاتا ہے۔ یہ دراصل بنی اسرائیل کی وہ بری عادت ہے، اور قومیں ایک دوسرے سے یہی چیزیں وراثت میں لیتی آتی ہیں۔ بہر حال، میری ایک چھوٹی سی کتاب ہے جس میں میں نے ستر یا سو کے قریب مثالیں ذکر کی ہیں۔ یہ سب نصوص وہ ہیں جن کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ عقل کے خلاف ہیں۔ ان میں سے ایک یہی مثال ہے اور ایک وہ حدیث ہے کہ اگر حوّا نہ ہوتیں تو کوئی عورت اپنے شوہر کے ساتھ خیانت نہ کرتی۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ ان سب کو عقل اور حقیقت کے ساتھ جوڑوں اور لوگوں کو یہ ثابت کروں کہ کبھی بھی نص عقل کے خلاف نہیں ہوتا اور نہ ہی حقیقت کے خلاف۔ اصل مسئلہ کہاں ہے؟ غلط فہمی میں۔

چلو، اب ہم یہیں ختم کرتے ہیں۔ تم نئی قاعدے کی سرخی لکھ لو تاکہ ہم اس کی شرح شروع کریں۔ قاعدہ یہ ہے: "نقل عقل کے خلاف نہیں ہو سکتا۔"

یہ کتنے نمبر کا قاعدہ ہے؟ "نقل عقل کے خلاف نہیں ہو سکتا۔"(لا الٰہ الا اللہ۔)

اب دلیلوں پر غور اس لیے کیا جاتا ہے کہ ان میں سے راجح کو پہچانا جا سکے۔ اور دلیلوں پر غور کا مقصد یہی ہے کہ راجح بات سامنے آئے۔

واللہ اعلم، اور اللہ تعالیٰ ہمارے نبی محمد ﷺ پر، آپ کے اہلِ بیت پر اور آپ کے صحابہ کرام پر رحمتیں اور سلامتی بھیجے۔

پانچواں درس

تمام تعریفیں اللہ رب العالمین کے لیے ہیں، اور درود و سلام ہو اللہ کے رسول امین ﷺ پر، اور آپ کے آل و اصحابِ طیبین طاہرین پر، اور ان پر جو قیامت کے دن تک نیک نیتی کے ساتھ ان کی پیروی کریں۔ اور ہم بھی انہی کے ساتھ ہوں اس کے فضل و کرم، جود و سخا سے، بے شک وہ بڑا جواد و کریم ہے۔

تعظیمِ دلیل کے قواعد میں سے ایک قاعدہ یہ ہے: "ادلہ میں غور و فکر صرف راجح کو پہچاننے کے لیے ہونا چاہیے۔"

یعنی ادلہ میں غور و فکر صرف راجح کو پہچاننے کے لیے ہونا چاہیے۔

اس قاعدے کا مطلب کیا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ جب تم کسی دلیل کا مطالعہ کرو تو تمہارا اصل مقصود یہ ہو کہ دلیل دیکھنے کے بعد راجح بات معلوم کرو۔ اور خبردار رہو کہ پہلے سے کوئی رائے قائم کرلو اور پھر دلائل میں صرف اس چیز کو تلاش کرو جو پہلے سے طے شدہ رائے کے موافق ہو۔ کیونکہ ایسا کرنے سے تمہارا دلائل کا مطالعہ کسی پچھلے قول کی تائید کے لیے ہوگا، اور یہ غلط ہے۔ یہ دلیل کی تعظیم نہیں بلکہ اپنی بات کی تعظیم ہے۔

لیکن اگر تم واقعی دلیل کی تعظیم چاہتے ہو تو کسی بات کو راجح قرار نہ دو جب تک دلیل کو نہ دیکھ لو۔ اس طرح تمہارا ترجیح دینا دلیل کی بنیاد پر ہوگا، نہ کہ تمہاری پہلے سے قائم کردہ رائے پر۔

کیا ان دونوں طریقوں میں فرق ہے؟ جی ہاں۔ فرق یہ ہے کہ اگر تم پہلے سے کوئی قول راجح قرار دے کر پھر اس پر دلائل ڈھونڈو گے تو تم نے اپنی ہی رائے کی تعظیم کی، لیکن اگر پہلے دلیل کو دیکھ کر پھر اس کی بنیاد پر ترجیح دی تو یہ اصل میں دلیل کی تعظیم ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ پہلے ہی ایک رائے اختیار کرلیتے ہیں، پھر جب وہ دلائل دیکھتے ہیں اور وہ ان کی رائے کے خلاف ہوتے ہیں، تو وہ دلائل کو اپنی رائے کے مطابق بنانے کے لیے توڑ مروڑ کرتے ہیں۔ یہ بڑی سنگین غلطی ہے اور انصاف و تجرد(غیر جانبداری) کے خلاف ہے۔

اصل تجرد(غیر جانبداری) یہ ہے کہ تم کسی عالم کی بات کو دوسرے عالم پر ترجیح نہ دو جب تک ہر ایک کی دلیل اور ان کے اصول نہ دیکھ لو، جن پر اس نے اپنی دلیل کو قائم کیا ہے۔ پھر اگر وہ دلیل صحیح اور مضبوط اور قرآن و سنت کے موافق ہے، تو تم اس قول کو ترجیح دو۔ لیکن یہ ترجیح نہ اپنے نفس کی خواہش سے ہوگی، نہ اپنے امام کی حمایت میں، نہ اپنے مسلک کی عصبیت میں، بلکہ اس لیے کہ دلیل ہی نے ترجیح پائی ہے۔

یعنی تمہاری ترجیح تابع ہوگی، متبوع نہیں۔ تابع کس کی؟ تابع دلیل کی۔ اور تم دلیل کو اپنی رائے کے تابع نہ بناؤ۔ پس تمہارے لیے جائز نہیں کہ تم دلائل کو اس طرح موڑو کہ وہ تمہارے امام کے مسلک سے مطابقت کریں۔ ایسے ارادے اور نیتیں دلائل دیکھتے وقت دل سے دور ہونی چاہییں۔

یہی حال اکثر اہلِ مذاہب کا ہے کہ وہ دلائل کو صرف اپنے مسلک کے قول کو راجح بنانے کے لیے دیکھتے ہیں، اور یہ تجرد اور انصاف کے خلاف ہے۔اسی لیے میری نصیحت ہے اے طلبۂ علم! کہ اپنی نیتوں کو بدلو اور ان کو اس گندگی سے پاک کرو جو تمہیں دلیل کو اپنی خواہش کے مطابق استعمال کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ کیونکہ یہ دلائل اس لیے نہیں نازل ہوئے کہ تم اپنی خواہشات پوری کرو، بلکہ اس لیے کہ اللہ جو چاہتا ہے وہ ان کے ذریعے ظاہر کرے۔ پس خبردار! تم اللہ کے مراد کو چھوڑ کر اپنی مراد کو ترجیح نہ دو۔ یاد رکھو کہ یہ دلائل انبیاء لے کر آئے، انہی کے ساتھ آسمانی کتابیں نازل ہوئیں۔ انہوں نے ان دلائل کو لوگوں تک پہنچانے میں سختیاں برداشت کیں، صبر کیا، اور تکالیف اٹھائیں۔ پھر تم آتے ہو اور کھلے عام ان دلائل کو اپنی خواہش کے مطابق ڈھال لیتے ہو! اللہ کی قسم! یہ حرام ہے، یہ ناجائز ہے۔

پس اصل تجرد یہ ہے کہ کوئی بات راجح قرار نہ دو جب تک دلیل کو نہ دیکھ لو۔ اور جب دلیل کو دیکھ کر راجح بات سامنے آجائے تو تمہاری ترجیح تابع ہو دلیل کی۔ یعنی دلائل میں دیکھو ایسے جیسے کوئی حق کا طالب دیکھتا ہے، نہ کہ ایسے جیسے کوئی اپنی خواہشات کو غالب کرنا چاہتا ہے۔ یاد رکھو کہ یہ معاملہ تمہارے اور اللہ کے درمیان ہے۔ کیونکہ نیتوں پر ہم مطلع نہیں ہوسکتے، لیکن اللہ دلوں کے بھید جانتا ہے اور سینوں کے راز جانتا ہے۔ اللہ تمہارے دل کو دیکھے گا کہ تم دلیل دیکھتے وقت حق کے طالب ہو یا اپنی خواہش کے۔ خواہ وہ تمہارے نفس کے موافق ہو یا مخالف، تمہارے امام کے مسلک کے مطابق ہو یا اس کے خلاف۔

واللہ! سب سے زیادہ دکھ دینے والی بات یہ ہے کہ ایک عالم، جو عقل مند اور ذہین ہو، لیکن وہ اپنے آپ کو اتنا گرا لیتا ہے کہ دلائل کو زبردستی اپنے امام کے مسلک سے ہم آہنگ کرے۔ میں کسی کا نام نہیں لینا چاہتا، لیکن شاید تم نے بھی دیکھا ہوگا کہ بڑے بڑے علماء، مشہور مصنفین، جب ان کی استدلالات دیکھو تو ان میں تکلف اور دلیل کو توڑنے مروڑنے کی کیفیت نظر آتی ہے تاکہ وہ اپنے امام کے موافق ہوجائے۔

ان کی طبیعت پر یہ بھاری پڑتا ہے کہ کوئی دلیل ان کے امام کے خلاف نکل آئے۔ تو وہ دلیل کو اپنے امام کی عقل سے سمجھتے ہیں، نہ اپنی عقل سے۔ دلیل کو دیکھتے ہیں لیکن صرف اس لیے کہ اپنے امام کے مسلک کو ثابت کریں، نہ کہ اللہ کی مراد کو سمجھیں۔ایسے لوگ دلیل کو اپنی شہوت اور خواہش کے تابع کرتے ہیں۔ اور ایسے لوگ بہت ہیں۔اسی لیے دلیل کی اصل تعظیم یہ ہے کہ اپنی ترجیح

میں جلدی نہ کرو، بلکہ پہلے دیکھو کہ دلیل کیا کہتی ہے، پھر اسی کے مطابق ترجیح دو۔

یہاں اس قاعدے سے متعلق کچھ فروع ہیں، اور ان میں زیادہ تر علماء کے اقوال منقول ہیں۔ ان کو سن لینا کافی ہے، اور ان کو لکھنے یا قید کرنے کی ضرورت نہیں، سوائے اس کے کہ کوئی خاص فائدہ یا قاعدہ سامنے آجائے۔

امام شاطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، اور وہ اہلِ بدعت کے استدلال کے طریقے کو بیان کر رہے ہیں کہ وہ کس طرح دلائل کو اپنی گھڑی ہوئی بدعتوں پر منطبق کرتے ہیں؛ کیونکہ انہوں نے پہلے بدعت ایجاد کی، پھر چاہتے ہیں کہ دلائل میں تلاش کریں کہ کوئی ایسی چیز مل جائے جو ان کی بدعت کے موافق ہو۔ وہ فرماتے ہیں رحمہ اللہ:

بدعتی شخص جب خواہشِ نفس اور سنت کے طریقے سے جہالت میں مبتلا ہو جاتا ہے، تو گمان کرتا ہے کہ جو چیز اسے اپنے عقل سے صحیح نظر آئی ہے، وہی سب سے مضبوط راستہ ہے اور باقی نہیں۔ پھر وہ اسی پر چل پڑتا ہے، تو اس سبب سے صراطِ مستقیم سے ہٹ جاتا ہے، اور اس حال میں گمراہ ہو جاتا ہے کہ اسے یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ سیدھے راستے پر ہے۔

پس اس امت کا بدعتی شخص اصل میں اسی وقت گمراہ ہوا جب اس نے دلائل کو خواہش اور شہوت کی بنیاد پر لیا، نہ کہ اللہ عز وجل کے احکام کے تحت سرِ تسلیم خم کرنے کی بنیاد پر۔ اور یہی بدعتی اور غیر بدعتی کے درمیان فرق ہے؛ کیونکہ بدعتی نے اپنی خواہش کو پہلا مقصد بنایا اور دلائل کو تابع قرار دیا۔ پھر اگر اس کے ساتھ شریعت کے اصولوں کی جہالت اور مقاصدِ شریعت سے ناواقفیت جمع ہو جائے تو معاملہ اور زیادہ سخت ہو جاتا ہے اور تحریف اور مقاصدِ شریعت سے انحراف کے زیادہ قریب ہو جاتا ہے۔

اس پر دلیل یہ ہے کہ تم کبھی کوئی بدعتی ایسا نہ پاؤ گے جو ملتِ اسلامیہ کی طرف منسوب ہو اور وہ اپنی بدعت پر کوئی شرعی دلیل نہ لاتا ہو۔ لیکن وہ دلیل کو اپنی بدعت اور اپنی خواہش کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔ اور یہ بدعتیوں کے گمراہ ہونے کی اصل وجہ ہے؛ کیونکہ انہوں نے پہلے بدعت کی ایجاد کی، پھر چاہا کہ اس بدعت کو دلائل سے تقویت دیں۔ حالانکہ اگر وہ ابتداء ہی میں دلائل کو صحیح نظر سے دیکھتے تو کبھی بھی انہیں بدعت تک نہ پہنچاتے۔

اب امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی بات سنو، وہ ان غلطیوں کو واضح کرتے ہیں جن میں بہت سے لوگ قرآن کے الفاظ کی تفسیر میں پڑ گئے۔ اور ان کے خلاف ورزی کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے پہلے کسی بات کو ترجیح دی، پھر چاہتے ہیں کہ اس پر استدلال کریں۔ وہ فرماتے ہیں رحمہ اللہ:

اصل مقصود یہ ہے کہ ایسے لوگ پہلے ایک رائے بنا لیتے ہیں، پھر قرآن کے الفاظ کو اس پر ٹھونس دیتے ہیں۔ کیا تم نے یہ خطا دیکھی؟ وہ پہلے اعتقاد قائم کرتے ہیں، پھر چاہتے ہیں کہ اس اعتقاد یا اس ترجیح کو قرآن یا سنت سے ثابت کریں، چاہے اس فہم میں ان کا کوئی سلف نہ ہو، چاہے نص کا ظاہر اس پر دلالت نہ کرتا ہو، اور نہ ہی قرآن یا حدیث کی کوئی سند ان کی بدعت کی تائید کرتی ہو۔ حالانکہ اگر ہم دلیل کو صحیح نظر سے دیکھیں... لیکن بدعتی کبھی بھی ایسا نہیں کرتا مگر یہ کہ وہ دلیل کو موڑتا ہے تاکہ اپنی بدعت کو اس سے تقویت دے سکے۔

میں اپنا ایک کرتا ہوں کہ بعض صوفیوں میں سے ایک نے ایک پڑوسی ملک میں مجھ سے مناظرہ کیا۔ اس نے کہا: آپ لوگ اجتماعی اذکار کو کیوں انکار کرتے ہیں؟ حالانکہ نبی ﷺ نے اس کے جواز پر نص بیان کی ہے۔ میں جانتا تھا کہ وہ کن احادیث کا حوالہ دینا چاہتا ہے، لیکن اس کو موقع دینے کے لیے میں نے کہا: کہاں ہے یہ؟

اس نے کہا: ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں، کہ نبی ﷺ نے فرمایا: «وما اجتمع قوم في بيت من بيوت الله يذكرون الله»...("اور کوئی قوم اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع نہیں ہوتی کہ اللہ کا ذکر کریں...")

کیا تم نے ایسے شخص کو دیکھا؟ وہ پہلے بدعت گھڑ لیتا ہے، پھر نصوص میں تلاش کرتا ہے تاکہ اپنی بدعت کو تقویت دے سکے۔

تو میں نے اس سے بطورِ جواب کہا: کیا یہ حدیث ابو بکر رضی اللہ عنہ نے سنی تھی؟

اس نے کہا: ہاں۔

میں نے کہا: کیا یہ عمر رضی اللہ عنہ نے بھی سنی تھی؟ اور میں نے صحابہ کی فہرست گنوا دی۔

اس نے کہا: ہاں، انہوں نے بھی سنی تھی۔

میں نے کہا: اچھا، مہاجرین اور انصار، ائمہ، سلف صالحین، ائمہ اربعہ اور ان سے پہلے کے دیگر ائمہ نے بھی یہ حدیث سنی تھی؟

اس نے کہا: ہاں، انہوں نے سنی تھی۔

میں نے کہا: کیا انہوں نے اسے اپنی کتابوں میں روایت کیا اور اس کے اسناد اور طرق کو بھی محفوظ کیا؟

اس نے کہا: ہاں۔

میں نے کہا: کیا ان میں سے کسی نے یہ فہم سمجھا جو تم نے سمجھا ہے؟

تو اس نے کچھ دیر کے لیے سر جھکا لیا اور کہا: کیا ہم پہلے لوگوں کے فہم کے پابند ہیں؟

میں نے کہا: یہی وہ نتیجہ ہے جس تک میں پہنچانا چاہتا تھا، اور وہ یہ کہ ہمارے لیے جائز نہیں کہ ہم دلائل کو صحابہ کے فہم سے ہٹ کر سمجھیں۔

پس دلائل کو سمجھنے کا طریقہ، خاص طور پر عقائد کے دلائل کو سمجھنے کا، ایک توقیفی معاملہ ہے۔ تمہارے لیے یہ جائز نہیں کہ دلیل کو دیکھ کر اپنے ذہن سے ایک نیا مفہوم نکالو، جو سلفِ صالحین کے طریقے پر نہ ہو؛ کیونکہ ایسا ممکن نہیں کہ بعد والوں پر کوئی ایسا خیر کھلے جو پہلے والوں پر نہ کھلا ہو۔
پھر میں نے اس سے کہا: یہ اجتماعی اذکار جو ایک آواز میں، ترنم کے ساتھ، جھوم جھوم کر، آواز کو کھینچ کر اور سوال و جواب کی صورت میں کرتے ہو، یہ تمہارے نزدیک خیر ہے یا شر؟ ظاہر ہے وہ شر تو نہیں کہے گا، بلکہ یہی کہے گا کہ یہ خیر ہے۔

میں نے اس سے کہا: یہ خیر جسے تم خیر سمجھتے ہو، کیا رسول اللہ ﷺ اور ان کے جلیل القدر صحابہ کو اس کا علم تھا یا نہیں؟
اب وہ کس طرح جواب دے؟ جو بھی جواب دے گا، وہ گڑھے میں گر پڑے گا۔

اگر کہے: انہیں علم تھا؛ تو اس پر جواب یہ ہوگا: وہ اسے جانتے تھے مگر عمل کیوں نہ کیا؟ یا پھر اسے امت کو کیوں نہ سکھایا؟
اور یہ تو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام پر اس بات کی تہمت ہے کہ انہوں نے خیر کی کسی بات کو چھپا لیا۔ اور رسول اللہ ﷺ نے صاف صاف دین کا پیغام نہیں پہنچایا، اگر یہ بات درست ہو کہ وہ اس بڑے خیر کے کام کو، جسے تم سب

سے بڑی عبادت سمجھتے ہو، جانتے تھے لیکن اس پر عمل نہ کیا اور امت سے چھپا لیا۔ یہ تو رسول اللہ ﷺ پر تہمت ہے۔

اور اگر وہ کہے: انہیں اس کا علم ہی نہ تھا؛ تو یہ پہلی سے بھی بڑی ہلاکت ہے۔

کیونکہ دین اور عبادت کے ایسے امور تمہارے لیے کیسے کھل سکتے ہیں جو سید المرسلین ﷺ پر بھی نہ کھلے، اور نہ تمام مخلوقات میں انبیاء و رسل کے بعد سب سے بہترین ہستیوں یعنی صحابہ کرام پر کھلے؟

لہٰذا ظاہر ہے کہ اس نے نہ پہلا جواب دیا نہ دوسرا؛ کیونکہ اسے پتا تھا کہ ہم اسے گڑھے میں گرا رہے ہیں۔ لیکن اس پر بات واضح ہو گئی اور اسے سمجھ آگئی کہ حق اس کے قول کے خلاف ہے۔

مگر اللہ جسے چاہے اپنے فضل سے ہدایت دیتا ہے، اور جسے چاہے اپنے عدل سے گمراہ کرتا ہے۔ اصل نکتہ یہ ہے کہ اہلِ بدعت جس گمراہی میں پڑے، اس کی وجہ یہی تھی کہ انہوں نے استدلال سے پہلے ترجیح کو مقدم کر لیا۔

علماء نے فرمایا ہے کہ اگر پہلے کی اپنی ترجیح میں خطا ظاہر ہو جائے تو لازم ہے کہ حق کی طرف لوٹ جاؤ۔ پس جب بھی تمہیں یہ معلوم ہو جائے کہ صحیح بات کسی اور مجتہد کے ساتھ ہے، یا تمہارے اس امام کے خلاف ہے جس کی تم تعظیم کرتے ہو، تو فوراً اپنے قول کو چھوڑ دو اور اسی کو ترجیح دو جو تمہارے دوسرے غور و فکر میں راجح معلوم ہو۔ اور جو فتویٰ تم نے اپنی پہلی ترجیح کی بنیاد پر دیا تھا تو اس میں کوئی حرج نہیں، اللہ تعالیٰ اس پر تمہیں پکڑنے والا نہیں، لیکن لازم ہے کہ تم اس حق کے سامنے جھک جاؤ جو تمہارے سامنے ظاہر ہو گیا ہے، اور اس شخص کی طرف نہ دیکھو جس نے اسے راجح قرار دیا ہے۔

یہ کلام ختم ہوا، شیخ عبد الرحمن بن حسن رحمہ اللہ کا۔

قاعدہ

اور اصولوں میں سے یہ قاعدہ بھی ہے کہ جب علماء کے اقوال نص کے خلاف ظاہر ہو جائیں تو ان کو چھوڑ دینا ان کے مقام و مرتبے میں قدح نہیں------

لہٰذا ۔ اے مبارک بھائی ۔ یہ گمان یا عقیدہ نہ رکھو کہ جب تم امت کے کسی امام یا اپنے کسی معزز عالم کے قول کو چھوڑتے ہو، تو یہ تمہارے امام پر طعن ہے، یا

یہ کہ اس کی منزلت گھٹا دی گئی ہے، یا یہ کہ تمہارے دل میں اس کا مقام کم ہو گیا ہے۔

بلکہ اللہ کی قسم! جب اس کا قول نص کے خلاف ظاہر ہو جائے تو اس کو چھوڑ دینا ہی اصل میں اس کی تعظیم ہے، یہی اس کا حق پہچاننا ہے، بلکہ یہی اس عالم کے ساتھ انصاف ہے۔

پس کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ یہ الزام لگائے کہ جس نے کسی عالم کے قول کے خلاف دلیل کو اختیار کیا، وہ علماء کی بے ادبی کرتا ہے، یا وہ علماء کو نظرِ اعتبار سے نہیں دیکھتا، یا اسے بڑے علماء کی قدریں معلوم نہیں۔

یہ سب کچھ، اللہ کی قسم، باطل بات ہے، ظلم ہے اور جھوٹ ہے۔ علماء کا احترام سید العلماء ﷺ کی مخالفت کر کے نہیں ہوتا۔ علماء کے اقوال کو چھوڑنے سے ان کی منزلت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان کی منزلت اپنی جگہ پر قائم ہے اور ایک بال برابر بھی نہیں گھٹتی۔ لیکن کسی عالم کی تعظیم یا اس کے احترام کی وجہ سے یہ لازم نہیں کہ تم اس کا قول قبول کرو جبکہ وہ دلیل کے خلاف ظاہر ہو۔

اور ہمیں ان لوگوں سے کوئی سروکار نہیں جن کا سینہ تنگ ہے، اور جو اس معاملے کو سمجھ نہیں پائے، اور پھر ہمیں بری بری گالیوں اور برے صفات سے یاد کرتے ہیں۔ ہم تو حق پر ہیں اور ہمیں اس پر ثابت رہنا چاہیے، چاہے ہمارے سامنے وہی لوگ آجائیں جو عقل نہیں رکھتے، اور وہ بہت ہیں، اللہ ان کی کثرت نہ کرے۔

پس واجب ہے ہم پر - اے طلبۂ علم - کہ ہم دلیل کے مطابق عمل کریں جسے ہم اپنے اجتہاد میں راجح سمجھتے ہیں، خواہ کوئی ہم سے اختلاف کرے۔ اور ساتھ ہی ان علماء کے ساتھ کمالِ ادب، تعظیم اور احترام باقی رکھیں جو ہمارے خلاف قول یا اجتہاد رکھتے ہیں۔

پس دلیل کی تعظیم اور اس کے مدلول پر عمل کرنا علماء کے مقام کو گھٹاتا نہیں۔ پس اے طالب علم! خبردار، کسی عالم پر صرف اس لیے بے ادبی نہ کرنا کہ وہ تمہارے خلاف ہے۔ اور طالب علم پر لازم ہے کہ صبر کرے جب کوئی اس کے خلاف ہو۔ یہ بھی اسی غُربت(اجنبیت) میں سے ہے جس کی خبر نبی ﷺ نے دی۔ہماری نگاہ میں دلیل کی تعظیم اور اس کے مدلول پر عمل کرنا، ہر انسان کی موافقت سے زیادہ اہم ہے، خواہ وہ کوئی بھی ہو۔

قاعدہ

اور اصولوں میں سے ایک یہ بھی ہے: دشمنی اور بغض کی وجہ سے دلائل کو رد کرنا جائز نہیں۔

مقصود "شنآن" سے بغض ہے۔ پس بعض لوگ ایسے ہیں کہ اگر وہ کسی کو ناپسند کریں، اور وہ ناپسندیدہ شخص حق پر ہو، تو وہ حق کو رد کر دیتے ہیں اور دلیل کو بھی رد کر دیتے ہیں۔ بلکہ وہ اس کی دلیل یا اس کے طریقۂ استدلال پر طعن کرتے ہیں، نہ اس لیے کہ وہ دلیل غلط ہے بلکہ صرف اس لیے کہ ان کے دل میں صاحبِ حق کے لیے بغض ہے۔ اور ایسے لوگوں کی دنیا میں بہت کثرت ہے۔

پس تم دیکھتے ہو کہ اہلِ سنت ہی حق پر ہیں لیکن صوفی حضرات اہل سنت پر بہتان لگاتے ہیں، ان کے طریقے کو برا بھلا کہتے ہیں، ان کی دلائل پر اعتراض کرتے ہیں، بڑے بڑے جھوٹے الزام اور برے اوصاف ان پر تھوپتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس لیے نہیں کہ وہ واقعی سمجھتے ہیں کہ ہم باطل پر ہیں، نہیں! بلکہ صرف اس لیے کہ ان کے دل میں بغض، حقد اور عداوت ہے۔ یہ انصاف کے خلاف ہے۔ پس کسی کی محبت تمہیں یہ نہ اُکسائے کہ اس کے باطل کو قبول کر لو، اور کسی کی عداوت تمہیں یہ نہ ابھارے کہ اس کے پاس موجود حق اور دلیل کو رد کر دو۔ محبت اور بغض دو جذبات ہیں، ان کا حق کے قبول یا رد سے کوئی تعلق نہیں۔ حق جس کے پاس ہو، اس سے قبول کرو، چاہے وہ شخص تمہیں ناپسند ہو۔ اور باطل جس کے پاس ہو، اسے رد کر دو، چاہے وہ شخص تمہیں محبوب ہو۔حقیقت تو یہ ہے کہ سب اہلِ بدعت اہلِ سنت کے خلاف یک زبان ہیں، حالانکہ اہلِ سنت اپنے عقائد کو کتاب و سنت کی متواتر دلائل سے ثابت کرتے ہیں۔ لیکن اہلِ بدعت اس طریقے اور ان دلائل کو محض بغض کی وجہ سے ناپسند کرتے ہیں۔ اللہ عز وجل نے فرمایا:﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ﴾ "اے ایمان والو! اللہ کے لیے قائم رہنے والے اور انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بنو، اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو۔ انصاف کرو، یہی تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔"

بلکہ اگر ہم تاریخ کی ایک سیاہ دورانیے پر نظر ڈالیں تو پتا چلتا ہے کہ تعصب اور دوسرے مذاہب سے بغض نے بعض اہلِ مذاہب کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ دوسرے مسلک والوں کے دلائل کو رد کر دیں۔ چنانچہ شافعیہ کے دلائل پر حنفیہ طعن کرتے ہیں، اور حنفیہ کے دلائل پر شافعیہ طعن کرتے ہیں، اور حنابلہ

اور مالکیہ بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس لیے نہیں کہ وہ دلیل پر طعن کرنا چاہتے ہیں، بلکہ صرف اس لیے کہ ان کے دل میں دوسرے مسلک اور اس کے ماننے والوں سے بغض موجود ہے۔

کیا یہ دلائل کی تعظیم ہے؟ نہیں، اللہ کی قسم! یہ دلائل کی تعظیم نہیں ہے۔

اگر تم کسی دن یہ دیکھنا چاہو کہ تم دلیل کے معزز کرنے والے ہو یا نہیں، تو خود کو آزما لو: اگر دلیل اس شخص کی زبان سے نکلی جسے تم ناپسند کرتے ہو اور جس کے خلاف تمہارے دل میں کچھ ہے، تو دیکھو کیا تمہارا سینہ اس کی دلیل کے لیے کھلتا ہے؟ اور اس کے طریقۂ استدلال کو قبول کرتا ہے؟ اور اس حق کو قبول کرتا ہے جو وہ بیان کرتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو تم اہلِ تجرد، عدل اور انصاف میں سے ہو۔ اور تم پر شہوتِ بغض غالب نہیں آئی کہ تم حق کو رد کر دو۔ لیکن یہ لوگ بہت کم ہیں۔

اب اگر علماء کسی بڑے فتنے میں نکل کر یہ کہیں: سنو اور اطاعت کرو، چاہے تمہاری پیٹھ پر کوڑے مارے جائیں یا تمہارے مال لے لیے جائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا... اور ہم ان احادیث کی شرح کرنے لگیں، تو کیا ہر شخص ان کو خوشی سے قبول کرے گا؟ جواب ہے: نہیں۔ بلکہ کچھ لوگ اہل سنت پر الزام لگائیں گے کہ وہ حکمرانوں کے ظلم کو جائز قرار دیتے ہیں، یا یہ کہ وہ حکمرانوں کے سامنے جھکنے والے ہیں، یا اور کوئی برا نام دیں گے۔ حالانکہ اہلِ سنت نے کبھی یہ نہیں کہا کہ یہ ہماری آباء و اجداد کی وراثت ہے۔ بلکہ انہوں نے ان سب کو کتاب و سنت کی دلائل سے ثابت کیا ہے۔ لیکن، جیسا کہ اللہ عز وجل نے فرمایا:﴿وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ تَعْرِفُ فِي وُجُوهِ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ ٱلْمُنكَرَ ۖ يَكَادُونَ يَسْطُونَ بِٱلَّذِينَ يَتْلُونَ عَلَيْهِمْ ءَايَٰتِنَا﴾ "اور جب انہیں ہماری صاف صاف آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو تم کافروں کے چہروں میں ناگواری دیکھتے ہو، قریب ہوتا ہے کہ وہ ان لوگوں پر ٹوٹ پڑیں جو انہیں ہماری آیات پڑھ کر سنا رہے ہوتے ہیں۔"

کیوں؟ صرف اس لیے کہ انہیں حق اور اہلِ حق اور دلائلِ حق سے نفرت ہے۔

اے طالب علم! خبردار! ایک دن اپنی آزمائش کرنا: جسے تم محبت کرتے ہو اگر وہ باطل پر ہو اور غلط استدلال کرے تو کیا تمہاری خوشامد یا محبت تمہیں یہ اجازت دے گی کہ تم اس کا باطل چھوڑ دو یا اس کے ساتھ موافقت کا اظہار نہ

کرو؟ اگر ایسا ہو تو سمجھو کہ ہمارا بغض اور محبت ہی قبول و رد کے پیمانے بن گئے ہیں۔

کم ہی ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنی عواطف سے بالکل الگ ہو کر حق کو قبول کرتے ہیں، یا باطل کو رد کرتے ہیں۔ یہی ہماری آج کی بڑی مشکل ہے۔

اللہ کی قسم**!** اگر لوگ حق سے بغض رکھیں تو تم ان کے سامنے دلیل سے حق بیان کرو، وہ قبول نہیں کریں گے؛ صرف اس لیے کہ ان کے دل میں بغض اور دشمنی ہے۔ لیکن اگر انہیں کوئی ایسی دلیل مل جائے جو ان کی خواہش کے مطابق ہو، چاہے وہ سب سے کمزور دلیل ہی کیوں نہ ہو، وہ اسے فوراً قبول کر لیں گے اور اسے کھلے عام اعلان کریں گے۔

کیا آپ نہیں دیکھتے کہ اشعری حضرات، اللہ عز وجل کے کلام کے حروف اور آواز کے ساتھ ثابت ہونے والی متواتر دلیلوں کو ایک ایسے شعری مصرعے سے بدلنے کی کوشش کرتے ہیں جس کا قائل بھی معلوم نہیں؟ وہ یہ کہتے ہیں:

إن الكلام في الفؤاد------------ وإنما جعل اللسان على الفؤاد دليلًا

*"کلام دل میں ہوتا ہے، اور زبان کو صرف دل پر دلیل بنایا گیا ہے ."*وہ دو شعری مصرعوں کی خاطر اللہ کے کلام کو اس کے اصل معنی سے پھیر دیتے ہیں، بلکہ اس کو اخطل کے نام سے منسوب کرتے ہیں، حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ وہ نصرانی اور شرابی تھا۔

یہ سب خواہشِ نفس کا نتیجہ ہے۔ خواہشِ نفس کبھی کبھی انسان پر غالب آجاتی ہے۔ ہم نے پہلے بھی خواہش کے بارے میں ایک قاعدہ ذکر کیا تھا کہ" *تم میں سے کوئی ایمان والا نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی خواہش میرے لائے ہوئے دین کے تابع نہ ہوجائے."*

اب ذرا اپنے آپ کو پرکھیں: اگر وہ شخص جس سے آپ کو نفرت ہے، اللہ نے اس کی زبان پر حق جاری کر دیا، تو کیا آپ کے دل میں اس حق کو قبول کرنے کا جذبہ ہوگا؟

اللہ کی قسم، میں اپنی بات کرتا ہوں: نہیں، سوائے اس وقت کے جب ایمان دل میں موجود ہو اور حق کی عظمت سامنے ہو۔ ورنہ عام طور پر لوگ قبول نہیں کرتے۔

آج اگر احمد (شیخ کا شاگرد) مجھے حق بات بتائے، تو نہ میں احمد کو قبول کروں گا نہ ہی اس حق کو، جو وہ کہہ رہا ہے، صرف اس لیے کہ میرے اور اس کے درمیان بغض اور دشمنی ہے۔ اسی طرح اگر میں احمد کو کوئی حق بات سناؤں، تو وہ بھی قبول نہیں کرے گا کیونکہ ہمارے درمیان کینہ ہے۔ پس اگر ہمارے قبول اور رد کرنے پر حاکم ہماری دشمنی اور محبت بن جائیں، تو یہ بہت خطرناک ہے۔

اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" :*جس نے اللہ کے لیے محبت کی، نہ کہ اپنی خواہش کے لیے، اور اللہ کے لیے بغض رکھا، نہ کہ اپنی خواہش کے لیے، اس نے اپنا ایمان مکمل کر لیا* ."یہی ہے اصل ایمان۔

اہلِ سنت والجماعت نے یہ اصول طے کیا ہے کہ حق، جس کے پاس سے بھی آئے، قبول کیا جائے گا، اور باطل، جس کے پاس سے بھی آئے، رد کیا جائے گا۔ اسی بنیاد پر اہلِ باطل نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو بھی رد کر دیا کیونکہ ان کے دلوں میں بغض، حسد اور عناد تھا۔ اور انہوں نے کہا: ﴿لَوْلَا نُزِّلَ هَٰذَا الْقُرْآنُ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ﴾ یہ قرآن دو بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ اتارا گیا؟"

یہ تھی ان کی دلیل حق رد کرنے کی! کہ اگر یہ واقعی حق ہوتا تو اللہ اسے کسی بڑے آدمی پر نازل کرتا، نہ کہ آپ جیسے کمزور انسان پر۔ اسی طرح قومِ نوح نے کہا: ﴿وَمَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّأْيِ﴾ ہم تو یہی دیکھتے ہیں کہ آپ کی پیروی وہی لوگ کر رہے ہیں جو ہمارے نزدیک کمینے اور پست ہیں۔"

اور کافروں نے قریش سے کہا: اے محمد! اگر تم چاہتے ہو کہ ہم تمہاری بات مان لیں، تو ہمارے لیے الگ مجلسیں بناؤ، ان فقیروں کے ساتھ نہیں بیٹھیں گے۔

یہ سب بغض، حسد اور جذبات کی باتیں تھیں، نہ کہ حق کی تعظیم۔ حق کو صرف اس وجہ سے رد کرنا کہ لانے والے کے ساتھ بغض ہے، یہ ہرگز دلیل کی تعظیم نہیں۔

پھر قاعدہ یہ ہے: کہ انصاف اور تجرد (یعنی غیر جانبداری) کا تقاضا یہ ہے کہ تمہاری دلیلوں میں وہ بھی شامل ہوں جو تمہارے خلاف ہیں اور وہ بھی جو تمہارے حق میں ہیں۔ یہ بات بالکل واضح ہے۔ انصاف یہ ہے کہ تم صرف وہی دلائل بیان نہ کرو جو تمہارے موقف کو مضبوط کرتے ہیں بلکہ وہ بھی پیش کرو جو تمہارے خلاف ہیں۔ صحیح دلیل کو اس خوف سے نہ چھپاؤ کہ اگر تم نے اسے بیان کر دیا

تو تمہارے مخالف کو فائدہ ہوگا اور تمہاری بات باطل ہو جائے گی۔ یہ دلیل کی تعظیم نہیں بلکہ خیانت ہے۔

بعض لوگ کتابوں کے گوشوں میں چھپی ہوئی ایسی دلیلوں کو جانتے ہیں، ان کی صحت سے بھی واقف ہیں، لیکن وہ انہیں چھپاتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ اگر وہ ظاہر کر دیں تو ان کی اپنی رائے باطل ہو جائے گی اور ان کے مخالف کی بات درست ہو جائے گی۔ تو وہ دعا کرتے رہتے ہیں کہ اللہ ان کے مخالف کو اس دلیل سے غافل رکھے۔ کیا یہ دلیل کی تعظیم ہے؟ ہرگز نہیں۔ دلیل کی تعظیم یہ ہے کہ آپ اس کو ظاہر کریں خواہ وہ آپ کے حق میں ہو یا آپ کے خلاف۔

پس انصاف اور دیانت داری یہ ہے کہ اپنی دلیلیں بھی پیش کریں اور مخالف کی بھی۔ اگر وہ دلیل ضعیف ہے تو اس کی کمزوری واضح کریں، اور اگر صحیح ہے تو اس کا جواب دیں۔ لیکن اسے چھپانا انصاف نہیں بلکہ خیانت ہے۔

لہٰذا طلبۂ علم کو چاہیے کہ وہ خواہشات اور جذبات کو دلیل پر حاکم نہ بنائیں۔ متقین کا طریقہ یہ ہے کہ دلیل پر نظر ایمان، تقویٰ اور خوفِ خدا کے ساتھ ہو۔ اگر آپ دلیل کو صرف اللہ کی رضا کے لیے دیکھیں گے، تو اللہ آپ کو ہدایت دے گا اور کبھی رسوا نہیں کرے گا۔ اللہ نے کبھی اس بندے کو رسوا نہیں کیا جو اخلاص کے ساتھ دلیل میں صرف اس کی رضا چاہتا تھا۔﴿هَلْ جَزَاءُ الإحْسَانِ إِلَّا الإحْسَانُ﴾ "کیا احسان کا بدلہ احسان کے سوا کچھ اور ہو سکتا ہے؟"

جیسا کرو گے ویسا پاؤ گے۔ لیکن اگر کوئی شخص دلیل کو اس لیے دیکھتا ہے کہ اسے اپنی خواہش کے مطابق موڑ سکے، تو اللہ اسے گمراہی میں ڈال دیتا ہے، اس کے دل اور کان پر مہر لگا دیتا ہے اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ کیوں؟ کیونکہ اس نے اللہ کی رضا نہیں چاہی بلکہ اپنی خواہش کی پیروی چاہی۔ تو اللہ اس سے توفیق چھین لیتا ہے اور وہ گمراہی میں جا پڑتا ہے، اور اس کے اجتہاد سے امت کے فائدے کے بجائے نقصان ہوتا ہے۔ خواہ وہ بڑا عالم ہی کیوں نہ لگے، لمبی داڑھی ہو، متون اور دلائل یاد ہوں، مگر اس کے نتائج امت کے لیے فساد پیدا کرتے ہیں۔

کیوں؟ کیونکہ اس نے دلائل کو تجرد اور اخلاص سے نہیں دیکھا۔ وہ صرف وہی دلائل بیان کرتا ہے جو اس کے موافق ہوں اور باقی کو چھپا دیتا ہے۔

پس اے طلبۂ علم! اللہ سے ڈرو، اور اپنی خواہشات کو حاکم نہ بناؤ۔ دلیل پر نظر ایمان اور تقویٰ کے ساتھ رکھو تاکہ اللہ تمہیں حق تک پہنچائے۔ دلیل پر نظر کا

مقصد صرف یہ ہونا چاہیے کہ اللہ کی مراد کیا ہے اور اس کی رضا کس میں ہے۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ آپ اپنی مخالفت کرنے والی دلیلیں بھی ظاہر کریں، پھر ان پر جواب دیں یا ان کی کمزوری بیان کریں۔ لیکن انہیں چھپانا خیانت ہے۔

ایک اور قاعدہ یہ ہے کہ دلائل کو تعطیل (بے معنی کرنا) اور تحریف (معنی کو بدل دینا) سے بچایا جائے۔ دلائل کی سب سے بڑی بربادی یہ دو ملعون چیزیں ہیں: تعطیل اور تحریف۔

تعطیل یہ ہے کہ دلیل کو اس کے صحیح معنی سے خالی کر دینا، جیسے کہ قرآن میں ہے:﴿وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ﴾ اور ایک بے کار کنواں (یعنی خالی کنواں)"یعنی کنواں جس میں کچھ نہ رہا۔ اسی طرح "خالی جیب"۔

تحریف یہ ہے کہ دلیل سے اس کے صحیح معنی کو چھین کر اس کی جگہ باطل معنی ڈال دینا۔یہ دونوں چیزیں بہت بڑی ہیں، لیکن تحریف میں دو مصیبتیں ہیں: ایک صحیح معنی کو ختم کرنا اور دوسری باطل معنی کو ٹھونس دینا۔اسی لیے علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ صحیح دلالت کو سلب کرنا حرام ہے، اور یہ بھی اجماع ہے کہ فاسد دلالت کو ٹھونسنا حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:﴿يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ﴾ یعنی جب ایک لفظ کا واضح اور جلی معنی اپنے مقام پر مقرر ہو جاتا ہے، تو یہ لوگ آ کر اس کے معنی کو بدل دیتے ہیں اور صحیح معنی سے پھیر کر غلط معنی پہنا دیتے ہیں۔مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان پر آتے ہیں:﴿ثُمَّ اسْتَوَى عَلَى الْعَرْشِ﴾
اور کہتے ہیں: اللہ کے لیے "استوی" نہیں ہے، بلکہ (استولی) مراد ہے۔ یعنی صحیح دلالت کو سلب کر لیا اور ایک فاسد دلالت گھسیڑ دی۔ یہ ہے تحریف۔اسی طرح آیت:
﴿بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ﴾پر آتے ہیں اور کہتے ہیں: اللہ کے ہاتھ نہیں ہیں۔ یہ صحیح دلالت کو ختم کر دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ مراد اس سے نعمت یا قدرت ہے۔ یہ فاسد دلالت داخل کرنا ہے۔ یہ ہے تحریف۔اسی طرح:
﴿وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ﴾ پر کہتے ہیں: اللہ کا کوئی چہرہ نہیں ہے، بلکہ "چہرہ" سے مراد ذات ہے۔ یہ بھی تحریف ہے۔ اسی لیے عموماً کوئی بندہ محرف (تحریف کرنے والا) نہیں بنتا جب تک کہ پہلے وہ تعطیل (انکار) کی سیڑھی نہ چڑھے۔ پہلے وہ صفات کا انکار کرتا ہے، پھر تحریف کرتا ہے۔ یہ دونوں بڑی مصیبتیں ہیں۔

اے وہ لوگو جو نصوص کی تعظیم چاہتے ہو! خبردار، ان دونوں میں نہ پڑنا۔ اے وہ لوگو جو نصوص کی تعظیم چاہتے ہو! تعطیل اور تحریف کے دائرے میں نہ جانا۔ اور یہ دونوں آج کے زمانے میں اور پچھلے زمانے میں بھی بہت تھے، بلکہ ہر دور کے بدعتی نصوص کو محرف کرتے آئے ہیں۔

سوچو تو! انہوں نے کتنی ہی آیات و احادیث میں اسماء و صفات کی نصوص کو تحریف کیا؟ کتنی نصوصِ قدر کو بگاڑا؟ کتنی نصوصِ احکام، دین اور ایمان کی بدلی گئیں؟ عذابِ قبر، نعیمِ قبر اور سوالِ قبر کی نصوص کو کیسے تحریف کیا؟ قیامت کی حقیقتوں مثلاً میزان، جنت، جہنم وغیرہ کی نصوص کو کہا: "اس سے مراد یہ نہیں بلکہ کچھ اور ہے"۔ ہر جگہ یہی انداز۔ یوں نصوص کو تحریف اور تعطیل کی دو تلواروں سے ذبح کر دیا گیا۔ یہ دو خنجر ہیں۔ بچو کہ ان دونوں سے نصوص کی گردن نہ کاٹو۔ نہ انکار کرو، نہ تحریف۔ نصوص کو ان کے صحیح معانی پر ثابت رکھو۔ اور جب نصوص اپنے صحیح معنی پر قائم رہیں تو تحریف کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔ لیکن جب کوئی انکار کر کے صحیح معنی کو نکال دیتا ہے، تو وہاں پھر تحریف گھس آتی ہےـلہٰذا نصوص کو دونوں گڑھوں سے بچاؤ: تعطیل اور تحریف۔ ہم نصوص پر ان کے صحیح ظاہر کے مطابق ایمان لائیں۔

اسی لیے ایک اہم قاعدہ یہ بنتا ہے **:نص کی تعظیم یہ ہے کہ اس کے ظاہر پر قائم رہا جائے۔**

پس ہم کہتے ہیں: نصوص کا اصل اصول یہ ہے کہ ان کے ظاہر پر قائم رہا جائے، جب تک کوئی قوی دلیل اس ظاہر سے پھیر نہ دے۔

یہی اصول ہے جس پر اہلِ سنت و جماعت متفق ہیں۔

یعنی جب بھی تمہارے سامنے کوئی نص آئے تو اس کے ظاہر سے تجاوز مت کرو۔ کوئی اور باطنی یا مجازی معنی تلاش مت کرو، جب تک کہ کوئی قطعی قرینہ نہ آجائے جو تمہیں ظاہر سے پھیر کر دوسرے معنی پر لے جائے۔ یہی نص کی تعظیم ہے کہ ظاہر پر رہو، اس سے آگے نہ بڑھو۔

لیکن اگر تم اہلِ بدعت کے طریقے دیکھو تو سب نصوص کو بلا کسی قرینے کے ظاہر سے پھیر دیتے ہیں۔ کیا یہ نصوص کی تعظیم ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ اسی لیے اللہ نے ان کو ذلیل کر دیا، ان سے توفیق چھین لی، وہ بدعت سے بدعت کی طرف بھٹکتے رہے، اپنی عمر اللہ کے غضب والے راستوں میں کاٹ دی۔ کیوں؟ کیونکہ انہوں نے نصوص کی تعظیم نہ کی۔

اہلِ کلام نے اسماء و صفات کی تمام نصوص کو ان کے صحیح معنی سے پھیر دیا۔ ان پر کبھی تو تعطیل کی، کبھی تحریف کی۔ اللہ نے ان کو خوار کر دیا۔ اے طالبِ علم! ڈر کہ کہیں اللہ تجھے بھی محروم نہ کر دے۔ یاد رکھ، تیرے علم کی کامیابی کا راز نصوص کی تعظیم میں ہے۔ اگر تو نصوص کو عظمت دے گا تو تیرا سفر محفوظ ہوگا، ورنہ برباد۔اسی لیے بڑے بڑے ذہین اہلِ بدعت، جو ہزاروں احادیث یاد رکھتے تھے، پھر بھی بے توفیق رہے۔ کیوں؟ کیونکہ وہ نصوص کو موڑتے اور ان کے صحیح معنی رد کرتے تھے تاکہ ان کی بدعت کے موافق بن سکیں۔

لیکن وہ علماء جنہوں نے نصوص کی تعظیم کی، اللہ نے ان کی زندگی کا خاتمہ بھی نصوص کی تلاوت پر کیا۔ دیکھو! ابن تیمیہؒ کا خاتمہ اس آیت کی تلاوت پر ہوا:﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَنَهَرٍ، فِي مَقْعَدِ صِدْقٍ عِندَ مَلِيكٍ مُّقْتَدِرٍ﴾
یہ اللہ کا کرم ہے، نصوص کی تعظیم کرنے والوں کو انہی پر موت آتی ہے۔

لیکن اہلِ کلام کا خاتمہ دیکھو۔ ان میں سے کئی اپنی موت کے وقت بھی فلسفیانہ بحثوں میں پڑے ہوتے۔ رازی نے خود کہا: "ہم نے اپنی عمر قیل و قال میں ضائع کی"۔

اسی لیے سب سے زیادہ شک میں مرنے والے اہلِ کلام ہیں، کیونکہ وہ نصوص پر شک کرتے اور عقل کو نقل پر مقدم رکھتے تھے۔ جو نص کے ظاہر کو ظنی قرار دے اور عقل کے قیاسات کو قطعی مانے، اس کا خاتمہ کیسے اچھا ہو سکتا ہے؟

پس اے طالبِ علم! نصوص کی عظمت اختیار کر۔ ان کے ظاہر پر قائم رہ۔ خواہش یا شبہ کے لیے ظاہر سے آگے مت بڑھ۔ یہی نجات ہے۔میں اللہ کے ہاتھ کو اس کے جلال و عظمت کے لائق ثابت کرتا ہوں، میں اللہ کے ہاتھ ثابت کرتا ہوں۔کیونکہ قرآن کہتا ہے:﴿بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ﴾، میں اللہ کے عرش پر استواء کو ثابت کرتا ہوں۔ اس لیے کہ اللہ کہتا ہے ﴿الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى﴾، ﴿اسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ﴾
اس سے مراد جنت الخلد ہے، کیونکہ ظاہر یہی ہے۔

اسی طرح ایک اور قاعدہ یہ ہے :**نص پر زیادتی بیان ہوتی ہے، نسخ نہیں ہوتی۔**
لیکن بعض لوگوں نے کہا: "زیادہ نص نسخ ہے"۔ اسی بنا پر انہوں نے کئی نصوص رد کر دیں۔مثلاً احناف نے کہا: وضو نیت کے بغیر صحیح ہے۔ کیونکہ

قرآن میں آیتِ وضو:
﴿فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ...﴾ میں نیت کا ذکر نہیں۔ انہوں نے کہا: نیت احادیث سے آئی ہے، یہ زیادتی ہے، اور زیادتی نسخ ہے، لہٰذا ہم نیت کی احادیث رد کرتے ہیں۔

کیا یہ صحیح ہے؟ نہیں، یہ غلط ہے۔ کیونکہ "إنما الأعمال بالنيات" صحیح حدیث ہے اور اس کا تقاضا ہے کہ وضو نیت کے بغیر صحیح نہیں۔ پس نیت شرط ہے۔

اسی طرح عجیب بات یہ ہے کہ احناف تیمم میں نیت کو شرط مانتے ہیں، حالانکہ آیت تیمم:﴿فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا﴾ میں نیت نہیں۔ یہ ان کا تناقض ہے۔اسی طرح وہ وضو میں "موالاۃ" (اعضا کو پے در پے دھونا) شرط نہیں مانتے۔ کیوں؟ کیونکہ قرآن میں ذکر نہیں۔ حالانکہ صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ ایک شخص کے وضو میں ایک جگہ خشک رہ گئی تو نبی ﷺ نے فرمایا: "ارجع فأحسن وضوءك"۔ لیکن انہوں نے کہا: یہ زیادتی ہے، اس لیے ہم نہیں مانتے۔یہ ہے ان کی بنیاد۔ کیا یہ نصوص کی تعظیم ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ (لیکن پھر بھی ہم کہتے ہیں:اللہ احناف پر رحم کریں ۔اے اللہ! اس فقہی اور اصولی لغزش کو ان کے لیے دنیا اور آخرت میں ٹھنڈک اور سلامتی بنا دے، اے رب العالمین۔) اور حنفیہ کے متاخرین پر لازم ہے کہ وہ اس کو درست کریں۔ جو حنفیہ علماء آج زندہ ہیں، ان پر واجب ہے کہ وہ اس اصل کو، جس میں ان کے اسلاف سے خطا ہوئی ہے، درست کریں، اگر ان پر اس کا خطا ہونا واضح ہو جائے۔ اور تعصبِ مذہبی انہیں یہ نہ پر مجبور کرے کہ وہ خطا پر ہی چلتے رہیں۔ کیونکہ حق کی طرف رجوع کرنا باطل پر ڈٹے رہنے سے بہتر ہے، میرے بھائی۔ یہ واجب ہے۔ جو گزر گئے اور وفات پا گئے ہم اللہ سے ان کے لیے مغفرت مانگتے ہیں۔ لیکن جو باقی ہیں ان کے لیے جائز نہیں کہ اس غلط اور باطل و فاسد قاعدے کو، سنتِ نبوی کی بہت سی باتوں کو رد کرنے کا سبب بنا لیں۔ اسی لیے ہمارے نزدیک قاعدہ یہ ہے کہ: "نص پر زیادتی بیان ہے، نسخ نہیں ہے"۔ تو موالات (اعضا کو پے در پے دھونا) والی احادیث نے آیت وضو کو بیان کیا، نسخ نہیں کیا؛ اور نیت والی احادیث نے وضو کی آیت کو بیان کیا، نسخ نہیں کیا؛ اور فاتحہ پڑھنے والی احادیث نے نماز کے بارے میں بیان کیا، نسخ نہیں کیا۔بیان اور نسخ میں فرق ہے۔ بیان دونوں دلیلوں میں جمع کر لیتا ہے، جبکہ نسخ میں ایک دلیل کو منسوخ اور باطل کر دیا جاتا ہے۔ اور جب تک ممکن ہو دونوں دلائل کو جمع کرنا واجب ہے۔

اور حنفیہ کے بارے میں عجیب تر بات ۔ بہت عجیب ۔ ایک اور فرع ہے، جسے ہم بطور مشق ذکر کرتے ہیں: زانی غیر شادی شدہ پر "تغریب" (یعنی ایک سال کے لیے جلاوطنی کی سزا) کا مسئلہ۔حنفیہ کہتے ہیں: ہم اسے قبول نہیں کرتے، کیونکہ یہ نص پر زیادتی ہے۔ کیونکہ قرآن میں فرمایا گیا:﴿الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ﴾ زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد، ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔" اور یہ نہیں فرمایا: "اور ایک سال کے لیے جلاوطن کرو"۔ جبکہ تغریب (جلاوطنی) صحیح مسلم کی حدیث عبادہ میں آیا ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "غیر شادی شدہ کے لیے سزا ہے سو کوڑے اور ایک سال کے لیے جلاوطنی"۔

سو کوڑوں کو انہوں نے قبول کر لیا، کیونکہ وہ قرآن میں ہے۔ لیکن ایک سال جلاوطنی کو رد کر دیا، کیونکہ یہ قرآن پر زیادتی ہے۔ اور قرآن پر زیادتی ان کے نزدیک نسخ ہے۔

(اب تم لوگو! اے قاعدے کے دعویدارو! تم کیا کہتے ہو؟ یہ زیادتی ہے؟ اے نعمان (شاگرد)! کیا ہی مزیدار بات ہے! اگر یہ ہذیان ہے تو بھی کیا ہی شیریں ہذیان ہے، کیونکہ یہ زیادتی "بیانیہ" ہے۔)

اللہ ہدایت کرے ائمہ حنفیہ پر رحم فرمائے۔ میرے بھائی! اللہ کی قسم، تعجب ہوتا ہے کہ اتنے بڑے ذہین لوگ بھی کیسے اس لغزش میں گر گئے! یہ اس بات کی علامت ہے کہ حق تک پہنچنا محض اللہ کا توفیق دینا ہے۔ نہ تمہارے زور بازو سے، نہ عقل سے، نہ کوشش سے۔اسی لیے حق پر وہ لوگ کامیاب ہوئے جو ان سے کم بحث کرنے والے، کم ذہانت والے اور کم علم والے تھے۔ انہیں حق پر کامیاب کس نے کیا اور ان ذہینوں کو گمراہ کس نے کیا؟ اللہ نے۔

لہٰذا اے طالب علم! خبردار! اپنی علمی راہ میں اور حق تک پہنچنے میں اپنے زور بازو، اپنی طاقت، اپنی محنت، اپنی کتابوں، اپنے وقت، اپنی یادداشت، اپنے ساتھیوں یا اپنے استاد کی قوت پر بھروسہ نہ کرنا۔یہ خیال نہ کرنا کہ تیرے دل میں اعتماد ہے ان مادی اسباب پر۔ اللہ تعالیٰ تیرے دل میں صرف یہی دیکھے کہ تو بالکل عاجز اور اس کا محتاج ہے۔ باقی یہ سب اسباب ہیں، جنہیں اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن اصل توفیق ان میں سے کسی میں بھی ذاتی طور پر نہیں ہے۔ اسی لیے ہمیں ہر سانس اور ہر لمحے میں اللہ تعالیٰ کے محتاج ہونا چاہیے۔ کہا جاتا ہے کہ امام ابن تیمیہ جب کسی مسئلے پر الجھ جاتے تو کہتے: میں اللہ سے ایک ہزار مرتبہ استغفار کرتا ہوں، پھر مسئلہ کھل جاتا ہے۔ اور وہ کون تھے! اگر

ان پر مسئلہ بند ہوتا تو وہ ہزار مرتبہ استغفار کرتے اور پھر حل ہو جاتا۔ بلکہ بعض اوقات وہ سنسان دیہاتوں میں نکل جاتے، چہرہ مٹی پر رکھ دیتے اور اللہ سے دعا کرتے: "اے وہ ذات جس نے داؤد کو علم سکھایا، اور سلیمان کو سمجھایا، مجھے بھی سکھا دے"۔ پھر اس سجدے سے اٹھتے نہیں مگر یہ کہ ان پر وہ مسئلہ کھل جاتا۔"

کیا تم ہمیشہ ایسا نہیں دیکھتے؟ کہ انسان اپنی ہر حرکت و سکون میں اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے؟چاہے دلائل موجود ہوں، چاہے معاملہ آسان لگ رہا ہو۔ خبردار! غفلت نہ کرنا۔

کیا تم جاننا چاہتے ہو کہ تم حقیقت میں اللہ پر متوکل اور اس کے محتاج ہو یا نہیں؟ دیکھو کہ ان کاموں میں بھی، جو تمہارے اختیار میں ہیں، تم اللہ کے محتاج ہو یا نہیں۔

اگر تم ان چیزوں میں بھی، جو بظاہر تمہارے اختیار میں ہیں، اللہ کے محتاج ہو، تو یہی حقیقت میں اللہ پر افتقار ہے۔

جوتا میرے سامنے ہے اور اس تک صرف دو قدم ہیں۔ کیا اس کے لیے بھی اللہ کا محتاج ہونا ضروری ہے؟ جی ہاں۔ میں اپنی طاقت سے چل سکتا ہوں، لیکن غور کرو: انہی دو قدموں میں تمہاری روح قبض ہو سکتی ہے، یا تمہارے پاؤں شل ہو سکتے ہیں۔ ہے نا؟ تم چل ہی نہ سکو۔ پس ہر وقت، حتیٰ کہ اپنے اختیار میں آنے والے کاموں میں بھی، اپنی عاجزی اور بے بسی کو دیکھو۔ یہی توفیق کی ایک خدمت ہے جو اللہ چاہتا ہے۔ کیونکہ اللہ جانتا ہے کہ یہ دل اس کا محتاج ہے۔

لیکن جو شخص اپنی طاقت، اپنی کتابوں اور اپنے حافظے پر بھروسہ کرتا ہے، اور کبھی رات کو اللہ کے سامنے سجدے میں گر کر دعا نہیں کرتا کہ:یا رب! میرے لیے اس مسئلے میں فتح دے۔ یا رب! مجھے حق کی طرف ہدایت دے۔ یا رب! مجھے صواب کی توفیق دے۔ یا رب! مجھے میری گمشدہ بات دکھا دے۔ یا رب! مجھے غلط بات سے بچا دے۔ اور پھر جب تحقیق کر لیتا ہے تو اللہ سے دعا کرتا ہے:اللهم إن كان هذا هو الحق فانشره بين الناس، وإلا فاطوه في عالم النسيان يا رب".اے اللہ! اگر یہ بات حق ہے تو اسے لوگوں میں پھیلا دے، اور اگر باطل ہے تو اسے بھلا دے۔"یہی ہے توفیق کا راستہ۔۔۔

لہٰذا تغریب (جلاوطنی) کی زیادتی نسخ نہیں ہے جیسا کہ حنفیہ نے کہا، بلکہ یہ بیان ہے۔

اسی طرح گواہ اور قسم سے فیصلہ کرنا، اس کو حنفیہ نہیں مانتے کیونکہ یہ سنت سے ثابت ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے:﴿فَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ﴾ تو اپنے مردوں میں سے دو گواہ بنا لو، اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں"--- اور یہ نہیں فرمایا: "اور ایک گواہ اور ایک قسم"۔ گواہ اور قسم سنت نے بڑھائے ہیں۔ یہ قرآن پر زیادتی ہے، لیکن ہم کہتے ہیں: یہ بیان ہے، نسخ نہیں ہے۔ اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

قاعدہ

اور اصولوں میں سے ایک یہ بھی ہے: "اگر راوی کی رائے اور اس کی روایت میں تعارض ہو تو اعتبار اس کی روایت کا ہوگا نہ کہ رائے کا"۔ یہ وہی حق ہے جس سے انحراف جائز نہیں۔ ؐ(شیخ اپنے شاگردوں سے)میں نے یہ تمہیں پہلے بھی سمجھایا ہے، ؟ کہاں سمجھایا تھا اور کس قاعدے کے تحت؟ آفرین! درست کہا۔ کون دہرائے گا؟ آواز دو!)ہر قاعدہ جس میں اللہ تعالیٰ کے کلام کے خلاف اختیار کرنا یا اس کی مخالفت شامل ہو تو واجب ہے کہ اسے رد کر دیا جائے۔ واجب ہے کہ اسے رد کر دیا جائے۔

ہم نے ذکر کیا تھا کہ ان قواعد میں سے ایک یہ ہے کہ نصف دلائل پر ہی عمل ہوتا ہے۔ یہ قاعدہ کس کے مذہب پر ہے؟ حنفیہ رحمہم اللہ کے۔

پس جو ہم نے تمہیں اس قاعدے میں باندھا ہے وہی حق ہے جسے قبول کرنا واجب ہے۔ اور یہی قول جمہور کا ہے۔ اور یہی ہے جو دلائل پر عمل کا تقاضا کرتا ہے، نہ کہ دلائل کو معطل کرنے کا۔

اے طالب علم! خوش ہو جا اپنے اصول پر اگر وہ دلائل پر عمل کو اپنے اندر رکھتا ہے۔ خوش ہو جا، اس پر مضبوطی سے پکڑ لے، اور اس پر خوب قائم رہ، اور اللہ کا شکر ادا کر۔ اگر تیرا اصل وہی ہے جس پر تُو دین داری کرتا ہے اور وہ دلائل پر عمل کو اپنے اندر رکھتا ہے تو یہ اللہ کی طرف سے بڑی نعمت ہے۔

(اور میں نے تمہیں اس کے فروع پہلے بھی بتا دیے ہیں، اور الحمد للہ۔ کیا تم نئے فروع چاہتے ہو؟ چاہتے ہو؟ ٹھیک ہے۔)

ایک مسئلہ: نماز میں چار مواقع پر ہاتھ اٹھانے کا مسئلہ۔ تکبیر تحریمہ کے وقت، رکوع کے لیے جھکتے وقت، رکوع سے اٹھتے وقت، اور پہلی تشہد کے بعد جب

کھڑا ہوتا ہے۔ ان مواقع پر ہاتھ اٹھانے پر صحیح اور صریح دلائل موجود ہیں کہ ہاتھ یا تو کندھوں تک یا کانوں تک اٹھائے جاتے ہیں۔ کیا یہ تمہارے لیے واضح ہے یا نہیں؟

جو شخص رفع ہاتھ کرنے کی روایت بیان کرتا ہے، وہ ابن عمر ہے، اور نافع نے ابن عمر سے صحیحین میں روایت کی ہے کہ انہوں نے دیکھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی ابتداء میں، رکوع کے لئے تکبیر کرنے پر اور رکوع سے اٹھنے پر اپنے ہاتھ کندھوں کے برابر اٹھاتے تھے۔ اور بخاری کی روایت میں ہے کہ جب دو رکعت مکمل کرنے کے بعد کھڑے ہوتے تو اپنے ہاتھ اٹھاتے۔ ابن عمر نے یہ رفع ہاتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بیان کیا۔

حنفی علماء کہتے ہیں: اگر یہ حدیث صحیح ہوتی تو اس کے راوی اس سے اختلاف نہ کرتے، کیونکہ ابن عمر سے روایت ہے کہ وہ صرف پہلی تکبیر میں ہاتھ اٹھاتے تھے۔ اس مسئلے میں ہمارے پاس روایت بھی ہے اور رائے بھی۔ حنفیوں نے رائے کو روایت پر مقدم کیا، جس کی وجہ سے انہوں نے دلیل کے مطابق عمل ترک کیا۔ جبکہ اکثریت نے روایت کو رائے پر مقدم رکھا، جس کی وجہ سے انہوں نے دلیل کے مطابق عمل کیا۔

اصل اکثریت کو اختیار کریں، کیونکہ یہی وہ طریقہ ہے جو دلیل کے مطابق عمل کرنے کو یقینی بناتا ہے۔ صحیح قول یہ ہے کہ نماز میں چار مواقع پر ہاتھ اٹھانا سنت ہے۔

اگر ہم ان کی بحث کو مزید بڑھائیں، تو ثابت ہے کہ صحیح اسناد کے مطابق ابن عمر اپنے ہاتھ اٹھاتے تھے، اور جو روایت میں ہاتھ اٹھانے کا ذکر نہیں ہے وہ کمزور ہے۔ یعنی حنفیوں نے غلط جمع کی، نہ اصل روایت صحیح، نہ رائے صحیح، بلکہ صحیح ثابت ہے کہ ابن عمر ہاتھ اٹھاتے تھے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ابن عمر نماز کی تکبیر کے وقت ہاتھ اٹھاتے، رکوع کے وقت اٹھاتے، اور "سمع الله لمن حمده، ربنا ولك الحمد" کہنے کے بعد بھی اٹھاتے۔

اور جب دو رکعت مکمل کر کے کھڑا ہوتا، تو اپنے ہاتھ اٹھاتا، اور ابن عمر نے یہ رفع ہاتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بیان کیا۔ یہ حدیث صحیح ہے، اور اللہ بہتر جانتا ہے۔

اب ہم اُس اصول کی طرف آتے ہیں جو اس کے بعد ہے: ہر قیاس جو نص سے متصادم ہو، وہ باطل ہے۔ اس اصول کا نمبر چوبیس ہے۔

(شیخ اپنے شاگردوں سے) کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہم اسے مغرب کے بعد ترک کر دیں اور آگے نہ بڑھائیں؟ نہیں، یہ طریقہ ہمیں پسند نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کرے جو درس کو بھاری یا مشکل بنائے۔

یہ شخص، شیخ حمد، میں نہیں چاہتا کہ علم کو بھاری سمجھنے والے لوگوں کے لیے تفصیل بیان کروں۔ یہ میرے دل کو توڑتا ہے اور مجھے افسوس میں مبتلا کر دیتا ہے کہ علم حاصل کرنے کے لیے وقت ضائع ہو رہا ہے۔ لیکن شاید اللہ چاہے کہ یہ فائدہ پہنچے، ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ آپ کو حنفیوں کے ساتھ معاف کرے۔)

اصل اصول یہ ہے: ہر قیاس جو نص سے متصادم ہو، وہ باطل ہے۔ یہ سب سے اہم دلائل میں سے ہے جنہیں لازم ہے کہ ان کی تعظیم کی جائے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض مذاہب میں بعض دلائل کو قبول کرنے سے انکار کیا گیا، کس وجہ سے؟ کیونکہ انہوں نے نصوص کے برخلاف قیاس کیا۔ اس لیے اہل سنت و جماعت کے نزدیک ہر قیاس جو نص سے متصادم ہو، وہ دین کا حصہ نہیں ہے۔

ہر قیاس جس کے قبول کرنے سے نصوص ترک ہو جائیں، وہ دین کا حصہ نہیں۔ یہ قیاس فاسد ہے۔ کیونکہ قیاس کی صحیحیت میں شرط ہے کہ وہ نص سے متصادم نہ ہو۔ اگر آپ اصولی کتابوں میں جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ انہوں نے پہلی شرط میں نص سے مخالفت نہ ہونا بیان کیا ہے۔ نصوص کی مخالفت کرنا گناہ اور پرانی بیماری ہے، اور سب سے پہلے اس میں ابلیس پڑا۔

جب اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے صحیح نص کے مطابق کہا: ﴿اسْجُدْ لِآدَمَ﴾، یہ قطعی نص ہے جو کسی بحث کا متحمل نہیں، ابلیس نے اسے قیاس سے مخالفت کی۔ اس نے کہا: میں آدم سے بہتر ہوں، مجھے آگ سے بنایا گیا اور اسے مٹی سے بنایا گیا۔ یہی نص سے قیاس کی مخالفت ہے۔

ابلیس نے ایک مدرسہ قائم کیا، جس کا نام ہے "نصوص کی مخالفت کے قیاس کا مدرسہ"، اور بہت سے لوگ وہاں سے تعلیم حاصل کرنے لگے۔ اگر کوئی دلائل کی مخالفت اپنے قیاس سے کرتا ہے تو سمجھو کہ وہ اس شیطانی مدرسہ سے فارغ التحصیل ہوا ہے۔ تو کبھی بھی ایسا قیاس قبول نہ کرنا جو نص سے متصادم ہو۔یہ معاملہ ہر مذہب میں پایا جاتا ہے، خاص طور پر حنفی مکتب میں، جہاں نصوص کی مخالفت والے قیاسات زیادہ ہیں۔ جب آپ کوئی قیاس دیکھیں جو نص سے متصادم ہو، تو نص کو مقدم رکھیں۔علماء رحمھم اللہ نے ابلیس کے قیاس کا

جواب دیا کہ قیاس تین وجوہات کی بنا پر فاسد ہے:
۱ (قیاس نص سے متصادم ہے، اور ہر نص سے متصادم قیاس باطل ہے۔
۲ (قیاس کرنے والے نے صحیح دلیل کا علم نہیں، جیسے ابلیس نے کہا "میں آگ سے ہوں، مٹی سے نہیں"، حالانکہ آگ تباہی کا ذریعہ ہے اور مٹی دنیا کی تعمیر کا ذریعہ۔
۳ (قیاس جزوی غلط ہے، جیسے ابلیس خود آگ کا حصہ تھا، جو فاسد اور برّا تھا۔

شاعر نے بھی کہا:

إِذَا افْتَخَرْتَ بِآبَاءٍ لَهُمْ شَرَفٌ ** قُلْ: صَدَقْتَ، وَلَكِنْ بِئْسَ مَا وَلَدُوا
"اگر تم اپنے آباؤ اجداد کے فخر پر فخر کرو، تو کہو: سچ کہا، لیکن انہوں نے برا بیج پیدا کیا"۔

اگر تم اپنے ان آبا و اجداد پر فخر کرتے ہو جنہیں شرف حاصل ہے تو کہو: نہیں، تم سچ نہیں کہہ رہے۔ ہاں یہ درست ہے کہ تمہارے ماں باپ کامیاب تھے، تمہارے ماں باپ بہادروں کے بہادر تھے، لیکن تم ان کے بعد آئے ہو جو بکریوں میں سے نکلتے ہیں۔ تم، تم ہو، تم ایک بکری ہو۔ اللہ زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے۔ تم اپنے باپ دادا اور اپنے اسلاف اور اپنے اصل پر فخر کرتے ہو، حالانکہ اصل پر فخر کرنے والے درحقیقت اسی شیطانی ایجنڈے کو آگے بڑھاتے ہیں: "میں بہتر ہوں، میں آگ سے بنا ہوں۔" یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے: میں فلاں قبیلے سے ہوں، میں فلاں خاندان سے ہوں۔ اور پھر؟ پھر کیا؟ جوان وہ نہیں ہے جو کہے میرا باپ یہ تھا یا میرا باپ وہ تھا، بلکہ جوان وہ ہے جو کہے: یہ میں ہوں۔ اپنا مجد اپنے ہاتھوں سے بنا۔

علماء رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ اصل عزت و عظمت وہ ہے جو تم نے خود کی ہو، نہ کہ وہ جو دوسروں نے تمہارے لیے کی ہو۔ اصل عزت وہ ہے جو تمہارے عمل سے ہے، نہ کہ وہ جو تمہارے ساتھ ویسے ہی ہو گئی۔ کیا تم نے خود منتخب کیا تھا کہ فلاں قبیلے میں پیدا ہو؟ نہیں، تم زبردستی وہاں آئے۔ حتیٰ کہ تم نے اپنا نام بھی نہیں چنا، نہ اپنی رنگت، نہ اپنی قومیت۔ تو پھر تم ان عطاؤں پر کیسے فخر کرتے ہو جو دوسروں نے تمہیں دیں، جن میں تمہارا کوئی عمل دخل ہی نہیں؟ لیکن یہ کہ تم تعلیم حاصل کرو، اعلیٰ ڈگریاں لو، بڑی نوکریاں حاصل کرو، پھر علم سیکھو، کتابیں لکھو، لوگوں کی رہنمائی کرو، شیخ اور مفتی بن کر لوگوں کو

نفع پہنچاؤ، یہ چیزیں حقیقتاً فخر کے قابل ہیں۔ اور اگر ان پر بھی تم انکساری کرتے ہوئے فخر نہ کرو تو یہ اور بھی بہتر ہے۔ لیکن اگر بالفرض تمہیں فخر کرنا ہی ہو تو پھر بھائی! ان چیزوں پر فخر کرو جن میں تمہاری اپنی محنت شامل ہے، جن پر تم نے اپنا پسینہ بہایا ہے۔

کہنا کہ "میرا باپ یہ تھا، میں فلاں قبیلے سے ہوں، میرے دادا یہ کرتے تھے، میرے پردادا ایسے تھے"۔ اچھا، اور پھر؟ تمہارا اپنا کیا کارنامہ ہے؟ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی کہے: میرے پڑوسی کے پاس اچھا سا گھر ہے، میرے پڑوسی کی گاڑی بہت اچھی ہے۔ تو تمہارا فخر کیا ہے؟ یہ ساری شیخیاں وہ ہیں جن میں تمہارا کوئی حصہ ہی نہیں۔ کیا تم نے اس بات کو سمجھا؟

پس ابلیس اس پر پورا اترتا ہے۔ اور یہ اس کی عقل مندی پر دلیل ہے یا اس کے بیوقوف ہونے پر؟ یہ اس کے بیوقوف ہونے پر دلیل ہے۔ وہ عزت والا اور مکرم تھا، ایک خاص مقام میں، اور اللہ تعالیٰ کے فرمان میں شامل تھا: ﴿اسْجُدُوا لِآدَمَ﴾۔ اس لیے جب اس نے انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس سے کہا: ﴿مَا مَنَعَكَ أَلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ﴾۔ تو وہ اس حکمِ سجدہ میں شامل تھا یا نہیں؟ وہ شامل ہی تھا۔

(یہ ایک فائدہ ہے جو میں نے ولَدِ راشد سے سیکھا۔ یہ آخری بات میں نے اس سے سیکھی، جب ہم شیطان کے بارے میں بات کر رہے تھے کہ آیا وہ فرشتوں میں سے تھا یا نہیں؟ تو میں نے کہا کہ وہ ان کے ساتھ سجدے میں شامل تھا، اور میں دیگر دلائل سے استدلال کرتا رہا، لیکن اس نے سیدھا کہا: دلیل یہی ہے کہ اللہ نے فرمایا: ﴿إِذْ أَمَرْتُكَ﴾۔ اللہ کی قسم یہ درست ہے، یہ آیت میرے ذہن میں نہیں آئی تھی، ہم نے یہ اس سے سیکھ لی، اللہ اسے توفیق دے۔)

اب وہ موجود نہیں ہے، تم نہیں جانتے وہ کہاں ہے، اس سے پوچھو۔ پس ہر قیاس جو نص سے ٹکرا جائے وہ باطل اور ناقابلِ اعتبار ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں فرماتا ہے: ﴿يُجَادِلُونَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ﴾۔ تو کیا یہ واضح حق کے بعد ہے یا صرف کوئی قیاس، کوئی رائے یا اجتہاد ہے؟ اللہ نے فرمایا: ﴿يُجَادِلُونَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُونَ﴾۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ﴾۔ یہ بالکل واضح اور صاف نص ہے، کسی بحث کی گنجائش نہیں، لیکن انہوں نے قیاس سے جواب دیا: ﴿أَنُطْعِمُ مَنْ لَوْ يَشَاءُ اللَّهُ أَطْعَمَهُ﴾۔ اچھا، جب عیسیٰ علیہ السلام آئے اور انہیں اللہ کی عبادت کا حکم دیا تو انہوں نے کہا: "أَآلِهَتُنَا خَيْرٌ أَمْ هُوَ؟" اور جب ان پر سود حرام

کیا گیا تو انہوں نے کہا: "إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا"۔ یہ سب قیاسات ہیں۔ قیاساتِ فاسدہ۔ قیاساتِ فاسدہ۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَكَذَلِكَ مَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي قَرْيَةٍ مِنْ نَذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَى أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَى آثَارِهِمْ مُقْتَدُونَ﴾۔ تم نے درست کہا اور میں نے غلط کہا۔

تو یہ لوگ کیا کرتے ہیں؟ اپنی حالت کو اپنے آباء و اجداد پر قیاس کرتے ہیں۔ یہی سب سے بڑا سبب ہے جس کی وجہ سے حق کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہی وہ قیاسات ہیں۔ یہی وہ قیاسات ہیں۔ میں تمہیں چند فقہی مثالیں دوں گا جن میں قیاس کے ذریعے نص کی مخالفت کی گئی ہے۔

اس میں نص کے مقابلے پر قیاس کی مثالیں شامل ہیں۔ ان میں سے ایک مثال یہ ہے – بھائیو! – کہ حنفیہ عورت کو اجازت دیتے ہیں کہ وہ خود اپنا نکاح اپنے ہاتھ سے کر لے۔ یہ ہمارے سامنے ایک حاضر مثال ہے اور ہم نے کئی بار ذکر کیا ہے۔ انہوں نے اس پر یہ دلیل دی کہ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں لوگوں کو بہت زیادہ ابتلاء اور حاجت پیش آتی ہے۔ یہ دلیل تو انہوں نے لے لی۔ لیکن ان کے پاس اس سے بھی بہتر دلیل ان کے نزدیک یہ تھی کہ انہوں نے نکاح کو مال پر قیاس کیا۔ جس طرح عورت کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے مال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرے، بغیر اپنے ولی کی اجازت کے، تو اسی طرح اسے یہ بھی حق ہے کہ وہ اپنی مرضی سے خود نکاح کر لے، بغیر ولی کی اجازت کے۔ یہ قیاس ہے یا نہیں؟ لیکن یہ قیاس نص کے مقابلے میں ہے، اور ہر وہ قیاس جو نص سے ٹکرا جائے وہ باطل اور ناقابلِ اعتبار ہے۔ ہر وہ قیاس جو نص کے مقابل ہو وہ فاسد ہے۔ اللہ ائمہ احناف پر رحم فرمائے۔

اور فقہی مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ علماء کے درمیان اختلاف ہوا ہے کہ کیا شوہر اپنی بیوی کو اس کے مرنے کے بعد غسل دے سکتا ہے یا نہیں؟ اور کیا بیوی اپنے شوہر کو اس کے مرنے کے بعد غسل دے سکتی ہے یا نہیں؟ یا پھر میاں بیوی ایک دوسرے کو مرنے کے بعد غسل نہیں دے سکتے؟ اس بارے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض نے کہا: یہ جائز نہیں ہے۔ اچھا، ان کے پاس اس کے ناجائز ہونے کی دلیل کیا ہے؟ انہوں نے کہا: اس لیے کہ میاں بیوی کے درمیان نکاح کا رشتہ ختم ہو چکا ہے۔ پھر انہوں نے قیاس کیا کہ جیسے اب اسے اپنی بیوی سے جماع کرنا جائز نہیں رہا، کیونکہ رشتہ ختم ہو گیا، تو کیا وہ مردہ بیوی سے جماع کرے گا؟ ظاہر ہے نہیں۔ تو انہوں نے کہا کہ چونکہ رشتہ

ختم ہو گیا ہے تو اسی طرح غسل دینا بھی جائز نہیں۔ یہ قیاس ہے یا نہیں؟ لیکن یہ قیاس بھی فاسد ہے۔

اگر پوچھا جائے کہ آپ نے اس کو فاسد کیوں کہا؟ تو ہم کہیں گے کہ اس لیے کہ یہ نص کے خلاف ہے۔ کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا:
»دخل عليّ النبي صلى الله عليه وسلم وأنا أقول: وارأساه. فقال: بل أنا وارأساه، ما ضَرّكِ يا عائشة لو مِتِّ قبلي فغسَّلْتُكِ وكفَّنتُكِ.«

یعنی نبی ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ اے عائشہ! تمہیں کوئی نقصان نہ ہوتا اگر تم مجھ سے پہلے فوت ہو جاتیں اور میں تمہیں غسل دیتا اور تمہیں کفن پہنانے کا انتظام کرتا۔ یہ بات بالکل واضح ہے۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یہ بھی فرماتی ہیں:لو استقبلتُ من أمري ما استدبرتُ، ما غسَّل رسولَ الله صلى الله عليه وسلم إلا نساؤه.«یعنی اگر میں اپنے معاملے کے آغاز میں وہ جانتی جو آخر میں جانا تو رسول اللہ ﷺ کو کوئی اور نہ غسل دیتا سوائے ان کی بیویوں کے۔اور دارقطنی میں یہ بھی روایت ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے وصیت کی تھی کہ ان کو حضرت علی رضی اللہ عنہ غسل دیں۔

تو یہ نصوص کیوں حنفیہ نے نہیں لیں؟ اس لیے کہ انہوں نے ان کے مقابلے میں قیاس کو ترجیح دی، تو ان کا یہ قیاس فاسد ہوا، کیونکہ ہر قیاس جو نص کے مقابل آجائے وہ فاسد الاعتبار ہوتا ہے۔

اور فقہی مسائل میں سے ایک اور مثال یہ ہے کہ علماء کے درمیان شراب سے علاج کرنے کے بارے میں اختلاف ہوا ہے۔ بعض اہلِ علم نے اس کو جائز کہا اور دلیل قیاس سے لی۔ انہوں نے کہا: جس طرح حرمتوں کو ضرورتیں جائز کر دیتی ہیں، اسی طرح شراب بھی ضرورت کے وقت علاج کے طور پر جائز ہو سکتی ہے۔ پس انہوں نے شراب سے علاج کو مردار کے کھانے پر قیاس کیا۔ تو انہوں نے دلیل کس چیز سے لی؟ قیاس سے۔ لیکن یہ قیاس فاسد ہے۔

اگر پوچھا جائے کہ آپ نے اس کو فاسد کیوں کہا؟ تو ہم کہیں گے: اس لیے کہ یہ نصِ صحیح و صریح کے خلاف ہے۔ کیونکہ طارق بن سوید جُعفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ سے شراب کے بارے میں پوچھا کہ کیا اسے دوا کے طور پر بنایا جا سکتا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: «إنها ليست بدواء، ولكنها داء» (یہ دوا نہیں بلکہ بیماری ہے)۔ اور سنن میں آپ ﷺ سے مروی ہے

کہ آپ نے فرمایا: «أنه نهى عن الدواء الخبيث» (آپ ﷺ نے خبیث دوا سے منع فرمایا)۔ اور آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: «إن الله لم يجعل شفاءكم فيما حرّم عليكم» (اللہ نے تمہاری شفا ان چیزوں میں نہیں رکھی جو تم پر حرام کی گئی ہیں)۔

پس یہ سب صحیح اور صریح نصوص ہیں جو شراب سے علاج کو حرام قرار دیتی ہیں۔ لہٰذا وہ قیاس جو ان کے مقابل آیا وہ بھی انہی فاسد قیاسات میں سے ہے، جس کو قبول کرنا، اس پر اعتماد کرنا یا اس پر تکیہ کرنا جائز نہیں۔

اسی طرح علماء کے درمیان اختلاف ہوا ہے کہ جو شخص رمضان کے دن میں بھول کر کھا پی لے اس کا کیا حکم ہے؟ بعض علماء نے کہا: اس کا روزہ ٹوٹ گیا اور اس پر قضا لازم ہے۔ اور انہوں نے اس پر قیاس سے دلیل لی۔ کہا کہ چونکہ وہ روزے کے سب سے بڑے رکن (یعنی امساک) کو فوت کر بیٹھا، اس لیے اس کا روزہ فاسد ہوا۔ لیکن اللہ کی قسم! یہ محض رائے، اجتہاد اور فاسد قیاس ہے، کیونکہ یہ نص کے مقابل ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ تو یہ ہے: «مَن أكل أو شرب ناسيًا في نهار رمضان فليتم صيامه، فإنما هو شيء أطعمه الله وسقاه» (جو شخص رمضان کے دن میں بھول کر کھا پی لے تو اپنا روزہ پورا کرے، یہ تو ایسی چیز ہے جو اللہ نے اسے کھلائی اور پلائی ہے)۔

پس اس لیے خبردار رہو کہ تم کسی نص کو قیاس کے ذریعے رد نہ کرو۔ اے طالبِ علم! خبردار رہو کہ تم کسی نص کو قیاس کے ساتھ ٹکرا کر رد نہ کرو، ورنہ تم ان لوگوں میں شامل ہو جاؤ گے جنہوں نے دلیل کی تعظیم نہیں کی۔

آؤ! اللہ کی قسم کھاؤ کہ یہ اصول بہت اہم اور نہایت مفید ہیں۔

ایک اور قاعدہ یہ بھی ہے: صحیح خبر الآحاد ہر صورت حجت ہے۔

خبر الآحاد سے مراد وہ خبر ہے جسے صرف ایک، دو یا تین لوگ روایت کریں، جب تک کہ وہ تواتر تک نہ پہنچ جائے۔ اور اس کے برعکس ہے خبر المتواتر۔ جب بھی خبر الآحاد صحیح ہو تو اہل سنت و جماعت کے نزدیک یہ حجت ہے۔ اگر یہ صحیح ہو اور نہ منسوخ ہوئی ہو — یعنی اس کا سند صحیح ہو اور اس کی دلالت منسوخ نہ ہوئی ہو — تو قسم ہے اللہ کی کہ یہ ہرگز حجت نہ ہونے کی صورت میں نہیں آتی۔ لہٰذا اسے قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا واجب ہے، اور اس کی مخالفت یا معارضت حرام ہے، کیونکہ یہ بذات خود حجت ہے۔

چاہے قیاس کے موافق ہو یا مخالف۔ (دھیان دو۔)چاہے عقائد میں ہو یا کسی اور معاملے میں۔ لہٰذا ہمارا قاعدہ یہ ہے: خبر الآحاد عقائد میں حجت ہے، خلاف اہل بدعت جو عقائد میں صرف متواتر قبول کرتے ہیں۔چاہے وہ کسی مسئلے میں عام ہو یا نہ ہو۔
چاہے اہلِ مدینہ کے عمل کے مطابق ہو یا نہ ہو۔چاہے اصول کے موافق ہو یا مخالف۔

ہمارے لیے صرف ایک بات اہم ہے: اگر یہ صحیح ہو تو یہ حجت ہے۔جب بھی یہ صحیح ہو تو اسے قبول کرنا، اس پر عمل کرنا، اس کے مطابق چلنا، اس کی اطاعت کرنا واجب ہے، اور نہ کہ اس کی مخالفت کرنا، نہ قولاً اور نہ فعلًا اور نہ کسی اور طریقے سے۔ یہ واضح ہے۔ لہٰذا اس قاعدے کے تحت آتا ہے:

خبر الآحاد عقائد میں حجت ہے۔

خبر الآحاد حجت ہے اگر چہ یہ واضح قیاس کے مخالف ہو۔

خبر الآحاد حجت ہے جہاں یہ عام ہو۔

خبر الآحاد اہل مدینہ کے عمل پر مقدم ہے۔

خبر الآحاد حجت ہے اگر چہ یہ اصول کے مخالف ہو۔

یہ سب ہم نے پہلے اس کے اصول، دلائل اور مثالوں کے ساتھ بیان کیا، اور اللہ کی حمد و ثنا کے ساتھ، اور اسی کے ذریعے توفیق اور ہدایت ملتی ہے۔

ایک اور قاعدہ یہ بھی ہے: صرف احتمال کی بنیاد پر نسخ باطل ہے۔
اور قواعد میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ محض احتمال کی بنیاد پر نسخ کو ماننا باطل ہے۔ محض احتمال کی بنیاد پر نسخ کو ماننا باطل ہے۔ اور یہ بات ائمہ حنفیہ رحمہم اللہ کے ہاں بہت زیادہ پائی جاتی ہے، کہ جب بھی ان کے نزدیک دو نصوص میں کسی درجے کا تعارض پیدا ہو جاتا ہے، تو ان میں سے کوئی کہہ دیتا ہے کہ یہ ناسخ ہے اور یہ منسوخ۔ اس مسئلے کو علما "نسخ بمجرد الاحتمال" کہتے ہیں۔

اسی لیے دلائل کے تعظیم کا تقاضا یہ ہے کہ تم کسی دلیل میں نسخ کو داخل نہ کرو، اور اس بات سے ڈرو کہ یہ نہ کہو کہ یہ دلیل منسوخ ہے، جب تک اس پر عمل کرنا ممکن ہو۔ خبردار رہو! اللہ کی قسم، جس نے معمولی احتمال یا ہلکی

سی مناسبت یا معمولی سا شبہِ تعارض کی بنا پر نسخ کا قول اختیار کیا، اس نے دلائل کی تعظیم حق کے ساتھ نہیں کی۔ کبھی نہیں! جیسا کہ بعض احناف ایسا کرتے ہیں۔

اور اگر تم امام طحاوی (صاحب العقیده الطحاویہ) رحمہ اللہ کی کتاب *شرح مشکل الآثار* کا مطالعہ کرو تو تمہیں اس قاعدے کی اہمیت اچھی طرح معلوم ہو جائے گی۔ اور اس عاجز بندے کی بھی ایک مستقل تحریر ہے جس میں میں نے قرآن میں کہی جانے والی منسوخ آیات اور سنت میں کہے جانے والے منسوخ احادیث کا پیچھا کیا ہے، اور تحقیق کے بعد میرے سامنے یہ بات واضح ہوئی کہ ان میں سے اکثر دعوے محض احتمال کی بنیاد پر کیے گئے نسخ کے دعوے ہیں۔ حالانکہ وہاں جمع ممکن تھا۔ اور جہاں جمع ممکن ہو، وہاں نسخ کا قول کرنا جائز نہیں۔

پس ہر وہ شخص جو دلائل میں جمع کی قدرت رکھنے کے باوجود نسخ کی طرف مائل ہوا، وہ درحقیقت احتمال کی بنیاد پر نسخ کی طرف مائل ہوا۔ اور احتمال کی بنیاد پر نسخ کرنا دلیل کی تعظیم کے منافی ہے۔ یہ دلیل کی تعظیم کے منافی ہے۔

اے طالب علمو! دلائل کی تعظیم کرو۔ خبردار! یہ نہ کہو کہ یہ ناسخ ہے اور یہ منسوخ۔ جب تک دو دلائل کے درمیان جمع ممکن ہے، نسخ کی طرف ہرگز مت بھاگو۔ جمع ممکن ہے۔ اور یہ بات علما کے کلام میں بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔

اور میرا گمان ہے کہ اس رسالے کا نام یہی ہے :*ابطال کثیر ممن دعا النسخ بالاحتمال*، یعنی "ان لوگوں کی ایک بڑی تعداد کے دعوے کا ردّ، جنہوں نے احتمال کی بنیاد پر نسخ کا دعویٰ کیا۔"

اور یہ بات ہمیں اگلے قاعدے کی طرف لے جاتی ہے: دلیل کو استعمال کرنا اسے چھوڑ دینے سے بہتر ہے۔ بلکہ دونوں دلائل کو استعمال کرنا، معاف کیجیے، دونوں دلائل کو استعمال کرنا بہتر ہے بجائے اس کے کہ ان میں سے کسی ایک کو چھوڑ دیا جائے، جب بھی ایسا ممکن ہو۔ دونوں دلائل کو استعمال کرنا اس بات سے بہتر ہے کہ ان میں سے ایک کو ضائع کر دیا جائے، جب بھی ایسا ممکن ہو۔ اسی کو ہم اس قاعدے کے ذریعے بیان کرتے ہیں کہ: "دلائل کے درمیان جمع کرنا واجب ہے جب بھی ممکن ہو۔"

چنانچہ جب بھی تمہیں دو دلائل کے درمیان کسی قسم کا بظاہر تعارض نظر آئے، تو کوشش کرو کہ ان کے درمیان تطبیق پیدا کرو اور ان کے مفہوم کو اس طرح ہم آہنگ کرو کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ موافق ہو جائیں، اور تم دونوں پر عمل کرسکو۔ پس جب تک تمہارے لیے دونوں دلائل میں تطبیق دینا ممکن ہے، چاہے وہ عموم اور خصوص کے قاعدے کے ذریعے ہو، یا اطلاق اور تقیید کے ذریعے، یا دلائل میں تطبیق دینے کے دیگر اصولوں کے ذریعے، تو یہ تم پر لازم ہے، اے طالب علم!

اللہ کی قسم! اللہ کی قسم! جس نے دلیل کو چھوڑ دیا حالانکہ وہ اس پر عمل کر سکتا تھا، اس نے دلیل کی تعظیم حق کے ساتھ نہیں کی۔ کلام کو باقی رکھنا اسے ضائع کرنے سے بہتر ہے۔ یہ تو انسانوں کے کلام میں بھی ہے میرے بھائی۔ انسانوں کی باتوں میں بھی تمہارے لیے جائز نہیں کہ ان کے کسی لفظ کو ردّ کر دو، جب تک کہ اس کو باقی رکھنا ممکن ہو۔ تو پھر اللہ رب العالمین کے کلام اور سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کے بارے میں کیا خیال ہے؟

خبردار! کسی موقع پر حدیث کو نہ چھوڑ دینا، اور نہ ہی اس کی دلالت کو ذرا سی مناسبت کے بہانے ردّ کرنا۔ نہیں، اصل یہی ہے کہ حدیث پر عمل کیا جائے۔ کلام کو باقی رکھنا اسے ضائع کرنے سے بہتر ہے۔

اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں فقہ کے بڑے بڑے قواعد پانچ معروف قواعد کے بجائے چھ کر دیتا: وہ پانچ مشہور قواعد اور اس کے ساتھ ایک چھٹا قاعدہ: "کلام کو باقی رکھنا اسے ضائع کرنے سے بہتر ہے۔" یہ ایک عظیم قاعدہ ہے اور دونوں جہانوں کے علما کے درمیان متفق علیہ ہے، اور یہ دلائل کے بارے میں کہا جاتا ہے۔

پس جب بھی دو دلائل کے درمیان تطبیق ممکن ہو تو، اے طالب علم! تمہارے لیے جائز نہیں کہ تم نسخ کا قول کرو۔ بالکل نہیں، نہ ابتدا میں اور نہ انتہا میں۔ نہ کسی سرے سے اور نہ کسی پہلو سے۔

اگلا قاعدہ یہ ہے: اصل یہ ہے کہ دلیل کے حقیقی معنی پر باقی رہا جائے، الا یہ کہ کوئی قرینہ ہمیں اس کے مجازی معنی کی طرف منتقل کر دے۔ اصل یہ ہے کہ دلیل کے حقیقی مفہوم پر باقی رہا جائے یہاں تک کہ ایسا قرینہ آ جائے جو ہمیں اس کے مجاز کی طرف لے جائے۔ اصل یہ ہے کہ دلیل کے ظاہر

پر باقی رہا جائے یہاں تک کہ ایسا قرینہ آ جائے جو اسے مجاز کی طرف پھیر دے۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ گفتگو میں اصل حقیقت ہی ہے۔ گفتگو میں اصل حقیقت ہی ہے۔ اور گفتگو میں اصل وہی حقیقت ہے جو ظاہر ہو رہی ہو، اس لیے بغیر کسی واضح دلیل یعنی قرینہ کے مجاز کی طرف منتقل ہونا جائز نہیں۔ یہی اصل ہے اور اسی پر اہل سنت والجماعت کا طریقہ چلا آ رہا ہے۔

پس نصوصِ صفات (اللہ تعالیٰ کی صفات سے متعلق نصوص) میں اصل یہی ہے کہ ان کے حقیقی معنی مراد لیے جائیں، اور ان کو ان کے مجازی معنی کی طرف پھیرنا جائز نہیں، الا یہ کہ کوئی دلیل ایسا کرنے پر مجبور کرے۔ اسی طرح آخرت کے دن سے متعلق نصوص میں بھی اصل یہی ہے کہ ان کے حقیقی معنی پر باقی رہا جائے، اور ان کو مجاز کی طرف منتقل کرنا ہمارے لیے جائز نہیں، سوائے اس کے کہ کوئی معتبر ناقل اس کی طرف لے جائے۔

یہ قاعدہ دلائل کے تعظیم کے اصولوں میں سے ہے۔ اس نے دلیل کی تعظیم حق کے ساتھ نہیں کی جو دلیل کے مجازی معنی کی طرف منتقل ہو گیا حالانکہ وہ اس کے حقیقی معنی لینے پر قادر تھا۔

قاعدہ: وحی کے دونوں سرچشموں (قرآن و سنت) کے لوازم بھی حق ہیں۔ وحی کے دلائل کے لوازم بھی حق ہیں۔ وحی کے دلائل کے لوازم بھی حق ہیں۔

پس جب بھی کوئی نص شارع کی طرف سے صحیح ثابت ہو گیا تو وہ اپنے منطوق (صاف الفہم معنی) میں بھی حق ہے، اپنے مفہوم (سمجھ میں آنے والے اشاروں) میں بھی حق ہے، اور اپنے لوازم (جو نتیجے اس سے نکلتے ہیں) میں بھی حق ہے، (اے احمد!) لہٰذا یہ بالکل ناممکن ہے کہ کسی صحیح دلیل سے کوئی باطل لازم نکلے۔

اور اگر کبھی تمہارے ذہن میں کسی دلیل سے کوئی باطل نتیجہ پیدا ہوتا ہے تو جان لو کہ یہ خرابی تمہارے اپنے عقل کی ہے، دلیل کی نہیں۔ یہ خرابی تمہارے اپنے فہم میں ہے، دلیل میں کوئی خرابی نہیں۔ کیونکہ یہ دلائل دراصل اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ وہی ہے جس نے قرآن اور سنت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا۔ اور شارع کا کلام ہمیشہ حق ہی ہوتا ہے اپنی ہر جہت

سے: منطوق میں، مفہوم میں اور لوازم میں۔ ان سب میں وہ ہمیشہ حق ہی ہوتا ہے۔

پس جب بھی تم سنو کہ کوئی شخص دلائل پر کوئی باطل نتیجہ لازم آنے کا ذکر کرتا ہے تو سمجھ لو کہ خرابی اس کے دماغ کی ہے۔ اگر وہ دلیل پر صحیح اصولوں کی بنیاد پر غور کرتا تو اللہ کی قسم، اس پر کوئی باطل لازم نہیں آتا۔

جیسے بعض مبتدعین نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو سنا: ﴿وَلِتُصْنَعَ عَلَى عَيْنِي﴾ (اور تاکہ تم میری آنکھ کے سامنے تیار کیے جاؤ)۔ تو اس نے کہا: اس کا مطلب یہ لازم آتا ہے کہ اللہ نے موسیٰ کو اپنی آنکھ تک اٹھا لیا تاکہ اپنی آنکھ پر اس کی پرورش کرے، تو موسیٰ اللہ کی آنکھ کا حصہ ہو گئے!

اللہ کی قسم! کیا یہ وحی کے نصوص کے لوازم میں سے ہے؟ میری رائے میں تو یہ نصوص کا مذاق اڑانا ہے، دلیل کے ساتھ استہزا اور تحقیر ہے۔ اگر تیرے ذہن میں جو بات ہے وہ عقلِ صحیح ہوتی تو تم اس کا صحیح لازم سمجھتے۔ یہ باطل نتیجہ اہلِ عقلِ کامل پر لازم کیوں نہ آیا؟ اہلِ سنت والجماعت پر یہ لازم کبھی نہ آیا۔

لہٰذا وہ تمام باطل لوازم جو بعض لوگ دلائل پر تھوپنا چاہتے ہیں، اللہ کی قسم، یہ صرف اہلِ بدعت ہی کرتے ہیں۔ ہم نے کبھی اہلِ سنت میں نہیں دیکھا اور نہ سنا کہ کسی دلیل پر کوئی باطل لازم آتا ہو۔ کیونکہ وحی کے لوازم حق ہیں، اے آدمی!

جیسے کہ اشعریہ (و ماتریدیہ)نے کہا: ہم صفتِ استواء پر ایمان نہیں لاتے، کیونکہ اس کا لازم یہ ہے کہ عرش اللہ سے بڑا ہو! اور اگر ہم عرش کو اللہ سے دور کر دیں تو رب گر پڑے گا! کیا ان باطل لوازم کی وجہ سے انہوں نے قرآن کی سات آیات کو، جن میں اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے کہ وہ عرش پر مستوی ہے، تحریف کا شکار کر دیا؟ اے آدمی! یہ تو ایک لازم ہے جو تم نے خود گھڑ لیا، تم نے ہی فرض کیا۔

پھر کوئی دوسرا آدمی آتا ہے اور کہتا ہے: میں اللہ کی صفتِ علو (بلندی) کو ثابت نہیں کرتا۔ ہم نے کہا: کیوں؟ کہنے لگا: کیونکہ اگر میں آج اللہ کے لیے علو ثابت کرتا ہوں تو زمین کی نچلی طرف جو لوگ ہیں، ان کے پاؤں اللہ کی طرف ہوں گے! اور پاؤں اللہ کی طرف کیسے ہو سکتے ہیں؟ یہ بھی ایک لازم ہے! لیکن یہ باطل لازم ہے۔ تم بس یہ ایمان رکھو کہ اللہ بلند ہے اور ان تفصیلات کو

چھوڑ دو۔ اللہ کی بلندی تمہارے عقل کے تابع نہیں کہ تم اسے سمجھ سکو، اور نہ ہی اس کی کیفیت معلوم ہے کہ تم اسے جان سکو۔ تم پر بس یہ ہے کہ کہو: میرا رب بلند ہے۔ ختم۔ کیا تم یہ نہیں کہہ سکتے؟ کہو: اللہ بلندی میں ہے۔

تفصیلات کو چھوڑ دو، ان لوازم کو چھوڑ دو، اور ان اعتراضات کو چھوڑ دو جو دلائل پر وارد ہوتے ہیں۔ ان سب کو چھوڑ دو۔

پھر ایک اور شخص آتا ہے اور کہتا ہے: حضرت ابو ہریرہ کی حدیث کہ "ہمارا رب آسمانِ دنیا پر اترتا ہے" یہ صحیح نہیں، یہ عقل کے خلاف ہے۔ ہم نے کہا: کیوں؟ کہنے لگا: کیونکہ رات کا آخری تہائی حصہ سورج کے گھومنے کے ساتھ گھومتا ہے۔ تو جہاں بھی رات ہو وہاں آخری تہائی رات ساتھ ساتھ آتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ ہر وقت آسمانِ دنیا پر نازل رہتا ہے! اور یہ درست نہیں۔

ہم کہتے ہیں: نہیں، یہ لازم درست نہیں، کیونکہ تم نے اپنی عاجز عقل کو ایک غیبی معاملے میں گھسیٹ دیا ہے جسے تمہاری عقل جاننے کی طاقت ہی نہیں رکھتی۔ تمہارے ذمہ صرف ایک کام ہے: یہ کہنا کہ میرا رب اپنے عرش پر مستوی ہے، ایسا استواء جو اس کی جلالت اور عظمت کے لائق ہے۔ میرا رب چہرہ رکھتا ہے، ایسا چہرہ جو اس کی جلالت اور عظمت کے لائق ہے۔ میرا رب کے دو ہاتھ ہیں، ایسے ہاتھ جو اس کی جلالت اور عظمت کے لائق ہیں۔ میرا رب آسمانِ دنیا پر رات کے آخری تہائی حصے میں نازل ہوتا ہے، ایسا نزول جو اس کی جلالت اور عظمت کے لائق ہے۔ بس، اور خاموش رہو۔ اپنی عقل کو یہ اجازت نہ دو کہ وہ دلائل پر باطل لوازم مسلط کرے۔

اسی لیے یہ قاعدہ دلیل کے تعظیم (بزرگی اور احترام) میں سے ہے۔ کیونکہ اگر ہم دلیل کی تعظیم کریں — دھیان دیں بھائیو! — اگر ہم دلیل کی تعظیم کریں تو اس کی تعظیم کے لازمی تقاضوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس کے لوازم کی تعظیم کی جائے، اس کے منطوق کی تعظیم کی جائے، اس کے مفہوم کی تعظیم کی جائے، یعنی اس کی تمام متعلقہ چیزوں کی تعظیم کی جائے۔ یہ ممکن نہیں کہ ہم دلیل کی ذات کی تعظیم کریں اور اس کی متعلقہ چیزوں کو نظرانداز کرکے انہیں اہانت کا نشانہ بنائیں۔ نہیں۔ بلکہ دلیل کی تعظیم کے لازمی تقاضوں میں سے ہے کہ اس کے لازمی نتائج کی بھی تعظیم کی جائے، اس کے مفہوم کی بھی تعظیم کی جائے اور اس کے منطوق کی بھی تعظیم کی جائے۔ دلیل کے اردگرد جو چیزیں ہیں ان کو بھی عظیم سمجھو، کیونکہ اردگرد کی چیزوں کی تعظیم کرنا اس چیز کی تعظیم کو لازم کرتا ہے جس کے گرد وہ چیزیں ہیں۔ اس کے

گرد موجود چیزوں کی تعظیم خود اس کی تعظیم کو واجب کرتی ہے۔ یہی وہ بات ہے جس پر ہم اللہ تعالیٰ کے سامنے دین داری کے طور پر قائم ہیں اور اپنے آپ کو اس کا پابند بناتے ہیں۔ اور اسی لیے دلائل حق ہیں۔

سنو! اللہ تبارک وتعالیٰ کیا فرماتا ہے۔ اللہ عز وجل فرماتا ہے: ﴿وَيَرَى الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ الَّذِي أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ﴾ یعنی وہ حق ہے اپنے منطوق میں بھی، اپنے مفہوم میں بھی اور اپنے لازمی نتائج میں بھی۔ پس جو شخص کسی دلیل پر کوئی باطل لازم ٹھہراتا ہے تو وہ اہل علم میں سے نہیں ہے، بلکہ یہ اس کی علمی اہلیت پر ایک قدح ہے۔ وہ (قرآن) حق ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿أَفَمَن يَعْلَمُ أَنَّمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ الْحَقُّ﴾ یعنی وہ حق ہے اپنے لازمی نتائج میں بھی، اپنے منطوق میں بھی، اپنے مفہوم میں بھی۔ کیا وہ شخص جو جانتا ہے کہ تیرے رب کی طرف سے اتارا گیا (کلام) حق ہے، اس کے برابر ہے جو اندھا ہے؟ یعنی وہ اندھا ہے جو نص کے منطوق سے اندھا ہو کر اس پر کوئی باطل چیز تھوپتا ہے، یا نص کے مفہوم سے اندھا ہو کر اس پر کوئی باطل چیز تھوپتا ہے، یا نص کے صحیح لازمی نتائج سے اندھا ہو کر اس پر جھوٹے اور باطل لوازم تھوپتا ہے؟ یہی وہ کجی اور فساد ہے جو ایسے فاسد فہم سے پیدا ہوتی ہے۔ یہی اس بگڑے ہوئے فہم کا انجام ہے۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ﴾ یعنی حق کے ساتھ، اور وہ حق ہے اپنے منطوق میں بھی، اپنے مفہوم میں بھی اور اپنے لازمی نتائج میں بھی۔ پس جس بات پر ہم اللہ تعالیٰ کے سامنے دین داری کے طور پر قائم ہیں اور میں پوری امت سے بھی مطالبہ کرتا ہوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اسی بات پر دین داری اختیار کرے، وہ یہ ہے کہ قرآن کی دلیلوں میں جو "حقانیت" ہے وہ حقانیت مطلق اور کامل ہے، ایسی کہ جس میں کسی پہلو سے بھی کوئی کمی یا نقص نہیں۔ یہ ایسا حق ہے کہ اس کے الفاظ میں اس سے بڑھ کر کوئی حق نہیں، یہ ایسا حق ہے کہ اس کے معانی میں اس سے بڑھ کر کوئی حق نہیں، یہ ایسا حق ہے کہ اس کے لوازم میں اس سے بڑھ کر کوئی حق نہیں، یہ ایسا حق ہے کہ اس کے مفاہیم میں اس سے بڑھ کر کوئی حق نہیں، اور اسی طرح قرآن سے متعلق یا اس کے گرد جو بھی چیز ہے وہ سب میں حق ہی حق ہے۔ یہی وہ بات ہے جس پر ہم اللہ تعالیٰ کے سامنے دین داری اختیار کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا بِالْحَقِّ﴾۔ تو نبی ﷺ کو اللہ نے حق کے ساتھ بھیجا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے انہیں کتاب اور سنت کے ساتھ بھیجا ہے، اور کتاب

و سنت حق ہیں۔ یہاں "حق" پر جو الف اور لام داخل ہے، وہ استغراق کا فائدہ دیتا ہے، یعنی کتاب و سنت ہر اعتبار سے حق ہیں، ان میں مطلق اور کامل حقانیت ہے، ہر اس چیز میں جو ان سے تعلق رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ذَلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ أَنزَلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ﴾۔

اور اس سارے مضمون کو اگر جمع کیا جائے تو، اے بھائیو! بات یہ ہے کہ ہر وہ نص جو اس پر دلالت کرتا ہے کہ کتاب اور سنت حق ہیں، وہ اس قاعدے کی صحت پر بھی دلیل ہے: کہ وحی (قرآن و سنت) کے لازمی نتائج بھی حق ہیں۔ کیونکہ حق سے صرف حق ہی لازم آ سکتا ہے، حق سے باطل لازم نہیں آ سکتا۔

اور قاعدوں میں سے ایک یہ بھی ہے: کہ دلیل کو اس کی مکمل دلالت سے گھٹا دینا، اس کی عظمت کو ضائع کر دینا ہے۔ دلیل کو اس کی مکمل دلالت سے کم کرنا، اس کی عظمت کو ختم کرنا ہے۔ تو یہ قاعدہ کون سے نمبر پر ہوا؟ بس، یہی آخری قاعدہ ہے۔ یہی ہمارے ہاں آخری قاعدہ ہے۔ امید ہے کہ آپ نے اس سے فائدہ اٹھایا ہوگا۔ جی ہاں، ہم نے اس پر مشق بھی کی، اس کو دہرایا بھی، اور ایک دوسرے کے ساتھ اس پر غور بھی کیا۔ اور آپ رسالہ دوبارہ دیکھیں، کیونکہ کچھ قواعد ایسے ہیں جن کو میں نے یہاں نہیں لیا، بلکہ انہیں قریب المعنی قاعدے کے تحت ایک فرع کی طرح شامل کر دیا ہے۔

آپ نے کیا کہا؟ کہ دلیل کی مکمل دلالت میں کمی کرنا اس کی عظمت کو ضائع کرنا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کتاب و سنت کی ایک دلیل کئی افراد (یعنی کئی پہلوؤں اور کئی مواقع) پر دلالت کرسکتی ہے۔ ایک دلیل کئی پہلوؤں پر اشارہ کر سکتی ہے۔ لیکن انسان آتا ہے اور ان میں سے بعض پہلوؤں پر تو ایمان لے آتا ہے اور بعض کو معطل کر دیتا ہے، تو اس نے دلیل کو اس کی حق دلالت کے ساتھ تعظیم نہیں دی، کیونکہ وہ دلیل کی مکمل دلالت پر ایمان نہیں لایا۔

اس بنیاد پر (توجہ کریں) ان سب کو جمع کریں اور یاد کریں، لکھ لیں: عام (یعنی عام الفاظ والی دلیل) کی دلالت کو خاص کرنا جائز نہیں، مگر کسی دلیل کے ساتھ۔ تو جس نے عام کے کچھ افراد کو بغیر دلیل کے خارج کر دیا، اس نے دلیل کی مکمل دلالت میں کمی کر دی۔ اور جس نے عام کو بغیر کسی دلیل کے خاص کیا، اس نے دلیل کی عظمت کو برباد کر دیا۔

لہٰذا لازم ہے کہ عام اپنی عمومیت پر باقی رہے اور اسے صرف کسی دلیل سے خاص کیا جائے۔ اور اس کے بعد یہ بھی سمجھ لیں: مطلق اپنی اطلاق پر باقی

رہے اور اسے صرف کسی دلیل سے مقید کیا جائے۔ پس جس نے عام کو بغیر کسی دلیل کے خاص کیا اس نے دلیل کی ہیبت اور عظمت میں کمی کی، اور جس نے مطلق کو بغیر دلیل کے مقید کیا، اس نے دلیل کی مکمل دلالت گھٹا دی، اور جو دلیل کی مکمل دلالت گھٹاتا ہے وہ دراصل دلیل کی عظمت اور اس کے مقام کو برباد کرتا ہے۔

یہی وہ بات ہے جو ہمیں ہمیشہ کہنے پر مجبور کرتی ہے – اے طلبۂ علم! – کہ اصل یہ ہے کہ عام اپنی عمومیت پر باقی رہے، اصل یہ ہے کہ مطلق اپنی اطلاق پر باقی رہے، اصل یہ ہے کہ دلیل اپنی ثابت شدہ حیثیت پر باقی رہے۔ یہ سب کس مقصد کے لیے ہے؟ اس لیے کہ ہم دلیل کو اس کی مکمل دلالت کے ساتھ پیش کریں۔ اس لیے کہ ہم دلیل کو اس کی مکمل دلالت کے ساتھ پیش کریں۔

اور آخر میں اے بھائیو! میں یہ کہتا ہوں: اگر انسان ان قواعد کو عملی طور پر اپنی زندگی میں برتنے کی کوشش کرے تو ان شاء اللہ تعالیٰ وہ دلیل کی تعظیم کرنے والا ہوگا۔ اور اسے یہ جان لینا چاہیے کہ دلیل کی تعظیم دراصل اللہ تعالیٰ کی تعظیم ہے۔ پس جس نے اللہ کو اس کی اصل تعظیم کے ساتھ تعظیم دینی ہے، اسے چاہیے کہ وہ کتاب و سنت کی دلیلوں کی تعظیم کرے۔ اور دلیل کی تعظیم دراصل اللہ کی حرمتوں کی تعظیم ہے، اور یہی دلوں کے تقویٰ کی علامت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ذَٰلِكَ وَمَن يُعَظِّمْ حُرُمَاتِ اللَّهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ عِندَ رَبِّهِ﴾ اور فرمایا: ﴿ذَٰلِكَ وَمَن يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِن تَقْوَى الْقُلُوبِ﴾۔

پس خبردار! یہ نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ آپ کے دل میں جھانک کر دیکھے کہ آپ دلیل کی دلالت کو ضائع کر رہے ہیں، یا اس کی عظمت میں کمی کر رہے ہیں، تو اس وقت اللہ تعالیٰ آپ پر غضبناک ہو جائے، اور آپ کے قدموں تلے سے توفیق کی بساط کھینچ لے۔

پس میری تم سب کو نصیحت ہے – اپنی زندگی میں بھی اور میرے بعد بھی – اور میری یہ وصیت یاد رکھنا اور مجھ سے اسے روایت کرتے رہنا تاکہ میں اپنے رب کے سامنے بری الذمہ ہو سکوں: طالبِ علم اپنی علمی زندگی میں کبھی کامیاب نہیں ہوگا اگر اس نے ابتدا ہی سے اپنی علمی بنیاد دلیل کی تعظیم پر نہ رکھی ہو۔ طالب علم کامیاب نہیں ہوگا اگر اس نے اپنی علمی راہ عدمِ تعظیمِ دلیل پر رکھی ہو۔ اور اس کا مفہومِ مخالفت یہ ہے کہ وہ طالب علم ضرور کامیاب ہوگا، اور سب سے مکمل کامیابی حاصل کرے گا اگر اس نے اپنی علمی زندگی

کی بنیاد دلیل کی تعظیم، اس کے احترام، اس کی تقدیس اور اس کو اس کے شایانِ شان مقام پر رکھنے پر رکھی ہو۔

اے اللہ! ہمیں ان میں شامل فرما جو دلیل کی حقیقی تعظیم کرتے ہیں۔ اے اللہ! ہمیں ان میں شامل فرما جو دلیل کی حقیقی تعظیم کرتے ہیں۔ اے اللہ! ہمیں ان میں شامل فرما جو دلیل کی حقیقی تعظیم کرتے ہیں۔ اے اللہ! ہم تجھ سے پناہ مانگتے ہیں کہ ہم کسی دلیل کو ضائع کریں بعد اس کے کہ وہ صحیح ثابت ہو چکی اور ہمیں معلوم ہو چکی۔ اے اللہ! ہم تجھ سے پناہ مانگتے ہیں کہ ہم کسی دلیل کی صحت کو ضائع کریں۔ اے اللہ! ہم تجھ سے پناہ مانگتے ہیں کہ ہم کسی دلیل کو ضائع کریں یا ہمارے دل اس سے کمی کریں یا ہمارے دل اس سے روگردانی کریں۔

اے اللہ! ہمیں دلیل والے بنا۔ اے اللہ! ہماری علمی اور عملی زندگی میں ہمیں دلیل والا بنا۔ اور ہمیں اس حال میں موت دینا کہ ہم دلیل کی تعظیم کرنے والے ہوں۔ اور ہمیں ان کے زمرے میں اٹھا کہ جو دلیل کی تعظیم کرتے تھے۔ اور ہمیں اس گھر میں داخل فرما جو ان کے لیے ہے جنہوں نے دلیل کے مطابق عمل کیا اور دلیل کی تعظیم کی۔

اور ہماری آخری دعا یہ ہے کہ تمام تعریفیں اللہ رب العالمین کے لیے ہیں، اور اللہ تعالیٰ درود و سلام بھیجے ہمارے نبی محمد ﷺ پر اور آپ کی آل اور تمام صحابہ پر۔

خاتمہ۔

03/10/2025